مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا

اس دھرتی پر انسان کا وجود حاصلِ تخلیق ہے۔ خالق نے اپنا یہ شاہکار اس لیے تخلیق کیا تھا کہ انسان اپنی بندگی، محبت، وفاداری اور تعصب کا تنہا مرکز صرف اور صرف اپنے خالق کو بنالے۔ بدقسمتی سے انسان نے اس دنیا میں ہر کام کیا ہے۔ بس یہی کام نہیں کیا۔

انسان نے بتوں کی پرستش کی۔ جانوروں کو پوجا۔ چاند، سورج اور تاروں کے سامنے ماتھا ٹیکا۔ درختوں اور پتھروں کے سامنے سر جھکایا۔ انسانوں کو رب بنایا۔ بادشاہوں اور پجاریوں کو مقدس جانا۔ علماء اور درویشوں کی عظمت کا اسیر ہوا۔ قوم اور فرقے کو اپنا تعصب بنایا۔ اکابر پرستی کو اپنا شعار بنایا۔ انسان نے یہ سب کچھ کر کے خود اپنی عظمت کو رسوا کیا اور خالق کی نظر میں خود کو ہمیشہ کے لیے گرادیا۔

مگر انسانوں میں چند ہی سہی، گنتی ہی کے سہی، کچھ لوگ ہوتے ہیں۔ غیر اللہ سے بے زار، انسان پرستی کے مرض سے آزاد، تعصّبات سے بلند اور تنہا ایک ہی رب کی محبت سے سرشار۔ دوسرے لوگ بتوں کے پجاری، انسانوں کے غلام، اپنے تعصّبات کے قیدی، اپنی خواہشات کے اسیر اور اپنے مفادات کا شکار ہوتے ہیں۔ جبکہ یہ لوگ غیر اللہ کی ہر قید کے بند توڑ کر خدا کی محبت، اس کی عظمت اور تنہا اس رب سے وفاداری کو زندگی بنائے رہتے ہیں۔ یہ اس خوف میں جیتے ہیں کہ بندگی کے اس مشن میں، خدا کی محبت کے اس کام میں وہ ناکام ہوگئے تو روز قیامت ان کا کیا ہوگا۔ کیونکہ روزِ قیامت کوئی اور کام قبول ہوگا نہ یہ لوگ کوئی اور کام سیکھتے ہیں۔

کروں گا کیا جو محبت میں ہوگیا ناکام
مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا

قیامت کا دن ایسے لوگوں کی سربلندی کا نام ہے۔ ایسے لوگوں کی کامیابی کا نام ہے۔

اسوہ ابراہیمی

قرآن مجید میں بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا: ''اسلم''، یعنی خود کو میرے حکم کے تابع کردو۔ انھوں نے فوراً عرض کیا کہ میں نے اپنے آپ کو عالم کے پروردگار کے حوالے کردیا، (البقرہ 131:2)۔ یہ اسوہ ابراہیمی ہی اسلام کی اصل تعریف ہے۔ یعنی اپنی مرضی، جذبات اور خواہشات کو اللہ کے حکم کے سامنے مٹا کر اس کی بات مان لینا۔

قرآن مجید میں یہ آیت یہود و نصاریٰ کے پس منظر میں آئی ہے۔ ان میں سے ہر کوئی آپ کا نام لیوا اور دین حق کا علمبردار بنا ہوا تھا۔ مگر درحقیقت خدا اور پیغمبروں کے نام پر کھڑے یہ لوگ اپنی خواہشات اور جذبات کے پیروکار تھے۔ ایسے میں ان لوگوں کو حضرت ابراہیم کی سیرت کے ذریعے سے یہ سبق دیا گیا کہ بندگی کا راستہ یہ نہیں ہوتا کہ اپنی خواہش کا دین اختیار کرلیا جائے۔ بلکہ اصل راستہ یہ ہے کہ اپنی مرضی، جذبات، خواہشات اور ذوق ونظریات کو اللہ کی مرضی کے تابع کردیا جائے۔ اپنے ظاہر و باطن کو اللہ کے حوالے کردیا جائے۔

پیغمبروں کی امتوں پر جب ایک طویل وقت گزر جاتا ہے تو دین کی اصل دعوت پر لوگوں کے جذبات، خواہشات اور تعصّبات غالب آجاتے ہیں۔ ان کے زیر اثر طرح طرح کی گمراہیاں جنم لیتی ہیں۔ مگر لوگ ان گمراہیوں کو مذہبی تقدس کا روپ دے دیتے ہیں۔ جیسے نصاریٰ نے رہبانیت کی بدعت کو دینی عمل بنادیا تھا۔ جبکہ یہود نے اپنی قوم پرستی کو دینی روپ دے دیا تھا۔

ایسے میں جب مجددین اور مصلحین اٹھتے ہیں تو ان کے مقابلے میں گمراہ لوگ پورے اعتماد سے کھڑے ہو کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہی سچائی پر ہیں۔ ایسے میں لوگوں کو اسوہ ابراہیمی یاد دلانا چاہیے۔ یعنی اسلام یہ ہے کہ انسان کا قول وفعل اللہ کی مرضی کے عین مطابق ہو اور اللہ کی کتاب اس کی تصدیق کر رہی ہو۔ اور ایسا نہیں تو یاد رکھو کہ تم ایک سرکش گروہ کے سوا کچھ نہیں۔ تمھارا کوئی اعتماد، کوئی یقین تمھیں اللہ کی پکڑ سے نہیں بچا سکتا۔

آخری اولاد

انسانوں کو اپنی ساری اولاد ہی پیاری ہوا کرتی ہے۔مگر سب سے چھوٹی اولاد بالعموم سب سے زیادہ پیاری ہوتی ہے۔اسے پیار بھی زیادہ ملتا ہے اور ذمہ داریاں بھی کم ہی ڈالی جاتی ہیں۔ اچھی اولاد والدین کی اس مہربانی پر شکرگزار رہتی ہے مگر بری اولاد بگڑ جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کسی کے ماں یا باپ نہیں۔مگر وہ اپنے بندوں سے ماں باپ سے کہیں زیادہ محبت کرتے ہیں۔خاص طور پر آخری امت اور بالخصوص امت مسلمہ کے اِس آخری حصے پر اس کی عنایات بہت زیادہ ہیں۔سابقہ امتوں اور صحابہ کرام کو ایمان لانے پر بہت اذیت اور تکالیف اٹھانا پڑیں۔لیکن آج ایمان لانے پر نہ آگ میں پھینکا جاتا ہے۔نہ ہاتھ پاؤں کاٹے جاتے ہیں۔نہ وطن چھوڑنا پڑتا ہے۔نہ لوگوں کے طعن وتشنیع سننے پڑتے ہیں۔

اس سے بڑھ کر جو ذمہ مسلمانوں پر عائد ہے یعنی دعوت دین، انفارمیشن ایج نے اس کو بھی بے حد سہل بنادیا ہے۔مگر محسوس یہ ہوتا ہے کہ آج کے مسلمان نعمتیں پا کر اچھی اولاد بننے کے بجائے بگڑ رہے ہیں۔وہ ایمان واخلاق کی پست ترین سطح پر ہیں لیکن خود کو فخر سے امت مرحومہ سمجھتے ہیں۔مسلمان اپنی اس عظیم دعوتی ذمہ داری سے بالکل غافل ہیں جو ختم نبوت کے بعد ان پر آچکی ہے۔مسلمان غیر مسلموں کو دعوت دین دینے کے بجائے ان سے نفرت میں مبتلا ہو چکے ہیں۔مسلمانوں کا رویہ وہی ہے جو لاڈ پیار سے بگڑ جانے والی آخری اولاد کا ہوتا ہے۔

مگر لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے ان کے سامنے بوڑھے والدین نہیں، عالم کا پروردگار ہے۔وہ بگڑی ہوئی ''اولاد'' کی طبیعت ٹھیک کرنا اچھی طرح جانتا ہے۔اس نے یہودیوں کے بھی بہت لاڈ اٹھائے، مگر وہ بگڑے تو ان کی شکل بگاڑ دی گئی۔مسلمانوں کو فوری طور پر اپنی اصلاح کرنی ہوگی۔ورنہ زیادہ وقت نہیں گزرے گا کہ ان کی طبیعت بھی ٹھیک کر دی جائے گی۔

ایک سبق

کچھ عرصے قبل ایک معروف داعی کی ایک وڈیو میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حوالے سے ان کے ایک بیان پر ان کے خلاف ایک ہنگامہ برپا ہوگیا تھا۔جب یہ واقعہ ہوا اس وقت بھی ہماری رائے یہ تھی کہ یہ جان بوجھ کر سیدہ کی شان میں گستاخی کا کوئی عمل نہیں بلکہ ایک انسانی غلطی ہے۔بعد میں خود انھوں نے ایک وڈیو بیان میں یہ کہا کہ جہالت کی وجہ سے ان سے غلطی ہوگئی۔اس طرح کی غلطی پر رائی کا پہاڑ بنالینا اور کسی کے خلاف ایسی مہم چلانا جس سے اس کی جان تک کو خطرہ ہوجائے اپنی ذات میں ایک انتہائی ناپسندیدہ رویہ ہے، جس کی جتنی مذمت کی جائے وہ کم ہے۔

تاہم اس سارے ہنگامے سے قطع نظر جو اُس وڈیو پر ہوا اس واقعے میں ایک ایسا سبق تھا جسے سیکھ لیا جائے تو ہم میں سے ہر شخص قیامت کی شرمندگی سے بچ سکتا ہے۔نہیں سیکھے گا تو اسے قیامت کی بدترین ذلت اور رسوائی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

یہ معروف داعی اس واقعے سے قبل بھی ٹی وی پر کئی دفعہ خواتین سے متعلق اپنے ایک خاص نقطہ نظر کا اظہار کر چکے تھے۔یہ نقطہ نظر صحیح ہے یا غلط ہمیں فی الوقت اس سے بحث نہیں۔تاہم یہ نقطہ نظر قائم کر کے جب انھوں نے صحیح بخاری کی ایک روایت کو سنایا پڑھا تو انھوں نے روایت سے وہ بات نہیں سمجھی جو اس میں بیان ہوئی۔یعنی آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے کریمانہ مزاج کی بنا پر ازواج مطہرات کا حد سے زیادہ خیال کرنا۔یہ وہی سبق ہے جو ایک دوسری روایت میں اس طرح دیا گیا ہے کہ ''تم میں سے بہترین وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ بہترین ہے اور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ سب سے اچھا ہوں''۔اس کے برعکس انھوں نے وہاں سے وہ بات برآمد کی جو کسی صورت بیان نہیں ہورہی۔یعنی خواتین کے بارے میں ایک منفی نقطہ نظر اور اس میں بطور ثبوت بالکل غلط طور پر ہماری ماں سیدہ عائشہ سے متعلق ایک غلط رویے کو منسوب کرنا۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے کہ اس غلطی کے بعد انھوں نے فوراً ایک وڈیو بیان جاری کیا جس

میں خود انھوں نے یہ اعتراف کیا کہ جہالت کی وجہ سے ان سے غلطی ہوگئی۔ تاہم جس طرح ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ غلطی جان بوجھ کر نہیں کی گئی تھی اسی طرح پوری دیانت داری سے یہ رائے بھی رکھتے ہیں کہ یہ غلطی جہالت کی وجہ سے بھی نہیں ہوئی تھی۔ جس شخص نے ساری زندگی دین کے لیے لگا دی ہو۔ برسہا برس سے علماء کی صحبت میں بیٹھتا اور دنیا بھر میں درس دیتا ہو اور صحیح بخاری کی روایت نقل کر رہا ہو وہ جاہل نہیں رہتا۔ اس غلطی کے پیچھے اصل عامل جہالت نہیں تھی۔ اصل عامل خواتین کے متعلق ایک متعصّبانہ نقطہ نظر تھا۔ یہی اصل مسئلہ ہے کہ جب اپنے تعصّبات کے تحت ہم قرآن وحدیث کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم اکثر غلط نتائج تک پہنچتے ہیں۔

تعصب صرف یہی خرابی پیدا نہیں کرتا کہ وہ ہمیں غلط نتائج فکر تک پہنچا دیتا ہے، بلکہ وہ ہمیں ایسا رویہ اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے جس کی کوئی وضاحت ہم روز قیامت اللہ کے حضور نہیں کر سکیں گے۔ مثلاً اسی معاملے میں دیکھیے کہ جن لوگوں نے ان صاحب کے خلاف ایک نفرت انگیز مہم چلائی، ان میں سے بیشتر کا تعلق ایک مخالف فرقے سے تھا۔ جبکہ جن لوگوں نے آگے بڑھ کر ان کی معافی کو قبول کیا اور ان کی حمایت میں بیانات دیے، ان میں سے بیشتر لوگ حق شناسی کے بجائے یہ اس وجہ سے کر رہے تھے کہ اس دفعہ تو ''اپنا'' آدمی زد میں آ گیا ہے۔ ورنہ یہی لوگ تھے جو کسی اور کو ایسے کسی معاملے میں کسی قسم کی معافی دینے یا اس کی معافی قبول کرنے کے قائل ہی نہیں تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ لوگ خدا کے حضور آخرت کی پیشی اور اس کی اس پکڑ کا یقین کر لیں تو کبھی اپنے تعصّبات کو قرآن وسنت پر حاوی نہ ہونے دیں۔ ان سے کبھی غلطی ہو بھی جائے تو توجہ دلانے پر وہ فوراً اپنی اصلاح کریں گے۔ اپنی رائے کے درست ہونے کا یقین ہو تب بھی اس کی بنیاد پر دوسروں کو کافر اور گمراہ قرار دے کر ان پر چڑھائی نہیں کریں گے۔ کیونکہ یہ صرف انبیاء علیہم السلام ہیں جو غلطی نہیں کرتے، باقی ہر انسان سے غلطی ہو سکتی ہے۔

یہ وہ سبق ہے جو اس واقعے میں پوشیدہ ہے مگر آج کا کوئی مذہبی انسان یہ سبق سیکھنے پر تیار نہیں۔

اسلام اور دنیا داری

اس شمارے میں معروف کالم نگار جاوید چوہدری صاحب کا ایک فکر انگیز مضمون شائع کیا جا رہا ہے۔ اس میں وہ سنگاپور کے آنجہانی وزیر اعظم لی کوآن یو اور وزیر اعظم نواز شریف کی ایک ملاقات کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ لی کوآن یو کے نزدیک پاکستان سنگاپور جیسا ترقی یافتہ اور صاف ستھرا اس لیے نہیں بن سکتا کہ اہل پاکستان اس دنیا کو عارضی سمجھتے ہیں اور آخرت کی زندگی کو اصل زندگی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس دنیا پر توجہ نہیں دیتے۔ چنانچہ جو لوگ اس دنیا پر یقین ہی نہیں رکھتے وہ اسے خوبصورت کیوں بنائیں گے۔

ہمیں نہیں خبر کہ یہ بات کس حد تک درست نقل ہوئی ہے، مگر بہت سے لوگوں کی یہ رائے ہے کہ اسلام میں صرف آخرت پر زور دیا جاتا اور دنیا کی کوئی حیثیت نہیں۔ خود مسلمانوں میں سے بہت سے لوگوں کی چونکہ یہی رائے ہے اس لیے اس پر ہمیں تبصرہ کرنا پڑ رہا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آخرت کی زندگی پر متنبہ کرنا انبیا علیہم السلام کا بنیادی کام تھا۔ اسی پہلو سے ان کو بشیر اور نذیر یعنی جنت کی خوشخبری دینے والا اور جہنم سے ہشیار کرنے والا کہا جاتا ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اکثر لوگ آخرت سے غافل ہو کر زندہ رہتے ہیں، اسی لیے قرآن مجید میں بڑی شدت اور تفصیل کے ساتھ آخرت کے احوال کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آخرت کی نعمتوں اور وہاں کے عذاب کے مقابلے میں دنیا کی کوئی حقیقت نہیں۔ تاہم کیا ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دین اسلام دنیا کی ترقی اور اس کی خوبصورتی اور جمالیات سے لطف اندوز ہونے سے منع کرتا ہے۔ اس سوال کا جواب قطعیت کے ساتھ نفی میں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے قرآن مجید وہاں کھڑا ہے جس کا کوئی مذہب تصور نہیں کر سکتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اے بنی آدم! ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو اور کھاؤ اور پیو، اور اسراف نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اے رسول ان سے کہو، کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دی ہیں۔ کہو، یہ ساری چیزیں دنیا کی زندگی میں بھی اہل ایمان کے لیے ہیں، اور قیامت کے دن تو خالصتاً انہی کے لیے ہوں گی۔ اس طرح ہم اپنی باتیں صاف صاف بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو علم رکھنے والے ہیں۔ (الاعراف 32-33:7)

ان آیات کو بار بار پڑھیے۔ اللہ تعالیٰ صاف بتا رہے ہیں کہ زینت، لباس، کھانے اور پینے میں لوگوں کو ہر طرح سے آزادی حاصل ہے۔ عام طور پر اہل مذہب جمالیات اور خوبصورتی سے دور رہنے کو نیکی کی معراج سمجھتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ صاف کہتے ہیں کہ دنیا کی ساری خوبصورتیاں انہوں نے اہل ایمان کے لیے تخلیق کی ہیں۔ مگر دنیا میں آزمائش کی بنا پر یہ نافرمانوں کو بھی دی جاتی ہیں۔ لیکن قیامت کے بعد کی زندگی میں تو یہ خالص اہل ایمان کے لیے کر دی جائیں گی۔

جس مذہب کی تعلیمات یہ ہوں وہ کیسے ممکن ہے کہ دنیا میں ایک اچھی زندگی گزارنے کا مخالف ہو۔ بات صرف یہ ہے کہ قرآن و حدیث کے بعض بیانات اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی زندگی کے بعض پہلوؤں کو درست طور پر نہ سمجھنے کی بنا پر لوگوں کو کچھ غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ ذیل میں ہم ان دونوں کی وضاحت کیے دیتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن و حدیث میں بہت سے مقامات پر دنیا کی زندگی کو دھوکہ اور متاع قلیل قرار دیا گیا ہے۔ تاہم ان جیسے تمام مقامات پر ہدف تنقید وہ لوگ ہیں جو آخرت کی زندگی کو جھٹلا کر یا فراموش کر کے دنیا کی فوری ملنے والی نعمتوں پر مرمٹتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک انتہائی برا رویہ ہے جو ہر قسم کے ایمان و اخلاق کے ہر تقاضے کو پامال کر دیتا ہے۔ اس پر تنقید بھی

ہونی چاہیے اور قرآن و حدیث میں تنقید آئی بھی ہے۔ مگر وہ لوگ جو آخرت کے بھی طلبگار ہیں اور اس کے لیے اچھا عمل کرتے ہیں، وہ جب حسنات دنیا کے طالب ہوتے ہیں تو بلاشبہ یہ رویہ قابل اعتراض نہیں۔ قرآن مجید نے ایک مقام پر اس کا بڑا خوبصورت تقابل کر کے دونوں رویوں کا فرق واضح کر دیا ہے۔

’’اُن میں سے کوئی تو ایسا ہے، جو کہتا ہے کہ اے ہمارے ربّ، ہمیں دنیا ہی میں سب کچھ دے دے۔ ایسے شخص کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اور کوئی کہتا ہے کہ اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی، اور آگ کے عذاب سے ہمیں بچا۔ ایسے لوگ اپنی کمائی کے مطابق (دونوں جگہ) حصہ پائیں گے اور اللہ کو حساب چکاتے کچھ دیر نہیں لگتی۔‘‘، (البقرہ 201-202:2)

یہ آیات واضح طور پر بتاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ دنیا اور اس کی بھلائیاں علی الاطلاق قابل مذمت نہیں بلکہ آخرت فراموشی کی وجہ سے ہیں۔ اگر آخرت کا تصور راسخ ہے تو پھر قرآن واضح ہے کہ تمام نعمتیں تو پیدا ہی اہل ایمان کے لیے کی گئی ہیں۔ ان کا استعمال کیسے غلط ہو گیا۔

جہاں تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی زندگی کا تعلق ہے تو واضح رہے کہ ان کی درویشانہ زندگی کی جو تفصیلات بیان ہوتی ہیں، وہ اس وقت کی ہیں جب وہ حکمران کے منصب پر پہنچ چکے تھے۔ ورنہ اس سے قبل یہ لوگ تجارت کرتے اور ایک اچھی زندگی گزارتے تھے۔ حضرت علی کے علاوہ باقی لوگ تو اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے سے قبل بہت بڑے تاجر تھے۔ حکمرانوں کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کا اسوہ حسنہ یہی ہے کہ رعایا کے غریب ترین افراد کی سطح پر زندگی گزاریں تاکہ عوام کے دکھ درد کبھی ان کی نگاہ سے اوجھل نہ ہوں۔ یہ عام لوگوں کے لیے کوئی ضابطہ قاعدہ نہیں ہے۔

جاوید چوہدری

کیلا بھی سوچنے کے عمل کو تیز کرتا ہے

مریض نے لمبی سانس لی، کمرے میں موجود لوگوں کی طرف غور سے دیکھا، مسکرایا، ہاتھ ہلایا، ہچکی لی اور ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں، اگلے دن دنیا بھر کے اخبارات میں خبر شائع ہوئی ''سنگاپور کے بانی وزیراعظم لی کوآن یو 23 مارچ کو 91 سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔''

لی کوآن یو اور سنگاپور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہیں، ہم جب تک لی کوآن یو کا نام نہ لیں اس وقت تک سنگاپور مکمل نہیں ہوتا اور ہم جب تک سنگاپور کو تسلیم نہ کریں اس وقت تک لی کوآن یو مکمل نہیں ہوتے، یہ دونوں جڑواں بھائی ہیں، سنگاپور 640 مربع کلومیٹر کا ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا، یہ انیسویں صدی تک ہولناک جنگل تھا، جنگل میں خونخوار درندوں، شیروں اور مگرمچھوں کا راج تھا، 1965ء تک جزیرے میں خطے کی سب سے بڑی دلدل بھی تھی، یہ بحری قزاقوں کا اپنا مسکن بھی تھا، دنیا کا کوئی شخص اس جزیرے کی طرف رخ نہیں کرتا تھا۔ انیسویں صدی میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہ جزیرہ خرید لیا، پہلی جنگ عظیم میں برطانیہ نے اسے بحری اڈہ بنا لیا، یہ دوسری جنگ عظیم میں جاپان کے قبضے میں چلا گیا۔ سنگاپور 1963ء میں ملائشیا کو واپس مل گیا لیکن 1965ء میں ملائشیا نے اسے بوجھ سمجھ کر سر سے اتار دیا، سنگاپور کو آزادی دے دی گئی، لی کوآن یو اس وقت سنگاپور کے وزیراعظم تھے، وہ پہلی بار 1959ء میں وزیراعظم منتخب ہوئے تھے، وہ آزاد سنگاپور کے پہلے وزیراعظم بنے، لی کوآن یو نے اس بدبودار جزیرے کو دنیا کا شاندار ملک بنانے کا فیصلہ کیا، پورے ملک سے ایماندار لوگوں کو چن کر جج بنایا گیا، ان ججوں کو مکمل خود مختاری دی گئی، یہ جج صدر اور وزیراعظم سے لے کر چپڑاسی تک تمام سرکاری اہلکاروں کو کسی بھی

وقت عدالت میں طلب کر سکتے تھے اور ان کی کھلے عام گوشمالی ہوتی تھی، لی کوآن یو نے انصاف کے بعد سنگاپور کے خوشحال طبقے سے انتہائی پڑھے لکھے، مہذب اور ایماندار لوگ چنے اور انہیں اپنی کابینہ میں شامل کر لیا، کابینہ کے لیے احتساب کا ایک کڑا نظام تشکیل دیا گیا، اس نظام سے کوئی مبرا نہیں تھا، اس کے بعد پوری دنیا میں بکھرے سنگاپور کے پڑھے لکھے اور ہنرمند نوجوانوں سے رابطہ کیا گیا، نوجوانوں کو بھاری معاوضے پر سرکاری ملازمتوں کی پیش کش ہوئی، آپ کو یہ جان کر حیرت ہو گی سنگاپور دنیا کا واحد ملک تھا جس میں سرکاری ملازموں کی تنخواہیں کارپوریٹ سیکٹر کے برابر رکھی گئیں، سنگاپور میں اگر ایک ایم بی اے نوجوان کو پرائیویٹ بینک دو لاکھ روپے تنخواہ دیتا تھا تو حکومت بھی اس کوالیفکیشن کے نوجوان کو دو لاکھ روپے تنخواہ دیتی تھی۔ لی کوآن یو نے سنگاپور کے قانون کو دنیا کا سخت ترین قانون بنا دیا تھا مثلاً سنگاپور میں کسی دیوار یا عوامی جگہ پر گالی لکھنے کی سزا موت تھی اور سنگاپور میں اگر کوئی وزیر یا مشیر کرپشن میں ملوث پایا جاتا تھا تو لی کوآن یو اسے خودکشی یا احتساب میں سے ایک آپشن کے انتخاب کا موقع دیتے تھے، وزراء عموماً اس لمحے خودکشی کو ترجیح دیتے تھے، لی کوآن یو کی اصلاحات کے نتیجے میں صرف تیس برسوں میں سنگاپور دنیا کا نواں امیر ترین ملک بن گیا، لی کوآن یو تیس برس بعد 1990ء میں مستعفی ہو گئے اور انہوں نے اپنے لیے نگران کا کردار منتخب کر لیا۔

میاں نواز شریف 1999ء میں سنگاپور کے دورے پر گئے، تو نواز شریف نے سرکاری مصروفیات کے بعد لی کوآن یو سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی، وہ لی کوآن یو سے لیڈرشپ اور ترقی کی ''ٹپس'' لینا چاہتے تھے، سنگاپور کے وزیراعظم نے لی کوآن یو کے ساتھ ان کی ملاقات طے کر دی، نواز شریف نے چند لوگوں کا انتخاب کیا اور اس شام لی کوآن یو کے پاس حاضر ہو گئے، یہ ملاقات سنگاپور کے وزیراعظم ہاؤس میں ہوئی، گفتگو کے آغاز میں لی کوآن یو نے انکشاف کیا

وہ مختلف حیثیتوں سے 8 مرتبہ پاکستان کا دورہ کر چکے ہیں لہٰذا وہ پاکستان کے جغرافیے، رسم و رواج اور لوگوں سے پوری طرح واقف ہیں، نواز شریف نے بڑے ادب سے ان سے پوچھا، کیا آپ اپنے تجربے کی بنیاد پر یہ سمجھتے ہیں پاکستان کبھی سنگاپور بن جائے گا، لی کوآن یو نے ذرا دیر سوچا اور انکار میں سر ہلا دیا، ان کا ردعمل، سفاک، کھرا اور غیر سفارتی تھا، حاضرین پریشان ہو گئے، لی کوآن یو ذرا دیر خاموش رہے اور پھر بولے ''اس کی تین وجوہات ہیں'' وہ رکے اور پھر بولے ''پہلی وجہ آئیڈیالوجی ہے، آپ لوگوں اور ہم میں ایک بنیادی فرق ہے، آپ اس دنیا کو عارضی سمجھتے ہیں، آپ کا خیال ہے آپ کی اصل زندگی مرنے کے بعد شروع ہو گی چنانچہ آپ لوگ اس عارضی دنیا پر توجہ نہیں دیتے، آپ سڑک، عمارت، سیوریج سسٹم، ٹریفک اور قانون کو سنجیدگی سے نہیں لیتے جب کہ ہم لوگ اس دنیا کو سب کچھ سمجھتے ہیں لہٰذا ہم اس دنیا کو خوبصورت سے خوبصورت تر بنا رہے ہیں'' وہ رکے اور ذرا دیر کے بعد بولے ''آپ خود فیصلہ کیجیے جو لوگ اس دنیا پر یقین نہ رکھتے ہوں، وہ اسے خوبصورت کیوں بنائیں گے؟ دوسری وجہ، آپ لوگوں کی زندگی کے بارے میں اپروچ درست نہیں، میں پیشے کے لحاظ سے وکیل ہوں، ہندوستان کی تقسیم سے پہلے میں اس علاقے میں پریکٹس کرتا تھا، میرے موکل کلکتہ سے کراچی تک ہوتے تھے، میں نے ان دنوں ہندو اور مسلمانوں کی نفسیات کو بڑے قریب سے دیکھا، میرے پاس جب کوئی ہندو کلائنٹ آتا تھا اور میں کیس کے جائزے کے بعد اسے بتاتا تھا تمہارے کیس میں جان نہیں، تم اگر عدالت میں گئے تو کیس ہار جاؤ گے تو وہ میرا شکریہ ادا کرتا تھا اور مجھ سے کہتا تھا، آپ مہربانی فرما کر میری دوسری پارٹی سے صلح کرا دیں، میں اس کی صلح کرا دیتا تھا اور یوں مسئلہ ختم ہو جاتا تھا جب کہ اس کے مقابلے میں جب کوئی مسلمان کلائنٹ میرے پاس آتا تھا اور میں اسے صلح کا مشورہ دیتا تھا تو اس کا جواب بڑا دلچسپ ہوتا تھا، وہ کہتا تھا وکیل صاحب آپ کیس دائر

کریں میں پوری زندگی مقدمہ لڑوں گا، میرے بعد میرے بچے لڑیں گے اور اس کے بعد ان کے بچے لڑیں گے'' لی کوآن یو رکے اور مسکرا کر بولے ''میرا تجربہ ہے جو قومیں اپنی نسلوں کو ورثے میں مقدمے اور مسئلے دیتی ہوں وہ قومیں ترقی نہیں کیا کرتیں اور تیسری اور آخری وجہ فوجی آمریت ہے، آپ کے ملک میں فوج مضبوط اور سیاستدان کمزور ہیں اور مجھے پوری دنیا میں آج تک کوئی ایسا ملک نہیں ملا جس نے فوجی آمریت میں رہ کر ترقی کی ہو''

یہ لی کوآن یو کا وژن تھا، وہ ہر معاملے میں اتنے ہی کلیئر تھے، آپ کو شاید جان کر حیرت ہو لی کوآن یو نے سنگاپور میں چیونگم چبانے پر پابندی لگا دی تھی، یہ پابندی ''لٹرنگ لاء'' کا حصہ تھی، اس قانون کے تحت سنگاپور میں چیونگم چبانا، کھلی جگہ تھوکنا اور واش روم کے استعمال کے بعد فلش نہ کرنا قانوناً جرم تھا، یہ آج بھی جرم ہے، تھوکنا اور فلش نہ کرنا کئی ممالک میں جرم ہے لیکن جہاں تک چیونگم کا معاملہ ہے اس لحاظ سے سنگاپور دنیا کا واحد ملک ہے جس میں ببل گم پر پابندی ہے، ملک میں چیونگم بیچنے والے کو 2940 ڈالر جرمانہ اور دو سال قید کی سزا ملتی ہے جبکہ چیونگم چبانے والے شخص کو پہلی بار پانچ سو ڈالر، دوسری بار ہزار ڈالر اور تیسری بار دو ہزار ڈالرز جرمانہ کیا جاتا ہے، یہ پابندی اور یہ سزا جس قدر حیران کن ہے اس پابندی کی بیک گراؤنڈ بھی اتنی ہی دلچسپ ہے، سنگاپور کی حکومت نے 1983ء میں عوام کو سرکاری فلیٹس بنا کر دینا شروع کیے، سنگاپور اس وقت دنیا کا واحد ملک ہے جس کے 91 فیصد لوگ ذاتی فلیٹس کے مالک ہیں، یہ تمام فلیٹس حکومت نے بنا کر دیئے، سنگاپور میں سرکاری ٹرانسپورٹ کا سسٹم بھی 1983ء میں شروع ہوا، عوام کے لیے فلیٹس اور ٹرانسپورٹ کا سسٹم بنا تو لوگ سرکاری بسوں اور فلیٹس میں چیونگم پھینک جاتے تھے، اس سے بسوں کی سیٹیں، ہینڈل، لاکس اور فرش خراب ہو جاتے تھے جب کہ فلیٹس کے دروازے اور کمپلیکس کی لفٹس بھی چیونگم کی وجہ سے پھنس جاتی تھیں، سنگاپور نے 1987ء میں

پانچ ارب ڈالر کی لاگت سے میٹرو ریلوے بھی شروع کی، میٹرو میں بھی چیونگم نے گندگی اور مسائل پیدا کرنا شروع کر دیے، لوگ ٹرین کے لاک میں چیونگم پھنسا دیتے تھے جس کی وجہ سے دروازے لاک ہو جاتے تھے اور یوں ٹرینوں کا شیڈول خراب ہوتا تھا چنانچہ حکومت نے چیونگم پر پابندی لگانے کا فیصلہ کیا، چیونگم پر پابندی کی تجویز 1991ء میں سنگاپور کی پارلیمنٹ میں پیش ہوئی، پارلیمنٹ میں اس پر پورا سال بحث ہوئی، پارلیمنٹ نے 1992ء میں اسے قانون کی شکل دے دی جس کے بعد سنگاپور میں چیونگم استعمال کرنا اور بیچنا دونوں جرم ہو گئے، اس قانون کے حیران کن نتائج برآمد ہوئے، سنگاپور دو سال میں دنیا کا صاف ترین ملک کہلانے لگا، آپ کو یہ جان کو یقیناً حیرت ہو گی سنگاپور میں 1992ء سے کوئی شخص، خواہ اس کا تعلق سنگاپور سے ہو یا غیر ملکی مہمان ہو اسے اس قانون سے استثنیٰ حاصل نہیں۔ پولیس چیونگم چبانے والے ہر شخص کو پکڑ لیتی ہے، آپ اس معاملے میں سنگاپور حکومت کی حساسیت ملاحظہ کیجیے، سنگاپور میں اکتوبر 2009ء میں انٹرپول کی جنرل اسمبلی کے 78ویں اجلاس کا فیصلہ ہوا تو سنگاپور حکومت نے 186 ممالک کی حکومتوں کو خط لکھ دیا تھا ''سنگاپور میں چیونگم پر پابندی ہے لہٰذا کوئی مندوب چیونگم لے کر سنگاپور میں داخل نہ ہو'' سنگاپور حکومت کا یہ خط محض دھمکی یا وارننگ نہیں تھی بلکہ حکومت نے ایئرپورٹ پر 186 مہمانوں کے سامان کی تلاشی بھی لی، سنگاپور میں 1992ء سے 2015ء تک بے شمار لوگ چیونگم استعمال کرتے ہوئے پکڑے گئے، ان میں امریکا اور یورپ کے وزراء تک شامل تھے، سنگاپور کی حکومت نے نہ صرف ان لوگوں کو جرمانہ کیا بلکہ ان سے جرمانہ وصول بھی کیا۔ سنگاپور کی حکومت اس قانون کے معاملے میں کس حد تک سخت ہے آپ اس کا اندازہ صرف ایک مثال سے لگا لیجیے، 1992ء میں جب یہ قانون بن رہا تھا تو یورپ اور امریکا نے اسے انسان کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی قرار دے دیا، بی بی سی نے اس قانون پر تبصرہ کرتے ہوئے

کہا ''چیونگم پر پابندی تخلیق کاروں کے ساتھ زیادتی ہے، تخلیق کار عموماً تخلیقی کاموں کے دوران چیونگم چباتے ہیں اور اس پابندی سے سنگاپور کے تخلیق کاروں کی تخلیقی صلاحیتیں متاثر ہوں گی، ان لوگوں کو سوچنے میں دقت ہو گی''۔ بی بی سی کا یہ تبصرہ جب وزیر اعظم لی کو آن یو تک پہنچا تو انہوں نے اس کا بڑا خوبصورت جواب دیا، وزیر اعظم لی کو آن یو نے کہا ''جو شخص چیونگم کے بغیر سوچ نہیں سکتا اسے چاہیے وہ کیلا ٹرائی کرے کیونکہ کیلا بھی سوچنے کے عمل کو تیز کرتا ہے''۔

یہ تھے لی کو آن یو! کاش اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ایک ایسا لیڈر عطا کر دے، ایک ایسا لیڈر جو قانون کو قانون بھی سمجھتا ہو اور اسے سپریم بھی قرار دیتا ہو۔

بس آپ امید کی شاہراہ کو اختیار کر لیجیے
کامیابی کا ہر راستہ اسی راہ سے نکلتا ہے (ابو یحییٰ)

ابو یحییٰ

انڈیا کی بیٹی اور انڈیا کی لیڈر شپ

ایک ممنوعہ فلم

مارچ 2015 میں بی بی سی چینل پر ایک ڈاکومنٹری فلم India's Daughter نشر ہوئی۔ یہ ڈاکومنٹری دسمبر 2012 میں ہندوستان کے دارالخلافہ نئی دہلی میں پیش آنے والے ایک اندوہناک واقعے کے حوالے سے تھی۔اس واقعے میں ایک لڑکی کو جو اپنے ایک دوست کے ہمراہ فلم دیکھ کر گھر لوٹنے کے لیے بس میں بیٹھی تھی، اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا گیا۔اس لڑکی اور اس کے دوست کو بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنا گیا اور چلتی بس سے پھینک دیا گیا۔

بعد میں یہ لڑکی زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے ہلاک ہوگئی۔اس پر زبردست مظاہرے شروع ہوگئے اور میڈیا پر بھی بہت ہنگامہ ہوا۔زبردست عوامی ردعمل کے نتیجے میں پولیس نے جلد ہی تمام ملزموں کو گرفتار کرلیا اور ان کو سزائے موت سنا دی گئی۔تاہم ان مجرموں نے سپریم کورٹ میں اپیل کر رکھی ہے اور سزا پر ابھی تک عملدرامد نہیں ہوا۔

بی بی سی کی ڈاکومنٹری میں صرف اس واقعے کی تفصیل ہی بیان نہیں ہوئی بلکہ پس منظر کی بہت سی باتیں بھی زیر بحث آئی ہیں، جن سے ہندوستان کے موجودہ سماج، وہاں کے مسائل اور ہندوستانی لیڈر شپ کی ذہنیت کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔گرچہ صاحب علم ونظر پہلے ہی ان چیزوں سے واقف ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی حکومت نے پولیس کے ذریعے سے اپنی عدلیہ سے اس ڈاکومنٹری پر پابندی لگانے کی درخواست کی جو منظور کرلی گئی۔چنانچہ بی بی سی نے اس فلم کو انڈیا میں نہیں دکھایا۔تاہم اس کے بعد فیس بک اور یوٹیوب پر یہ فلم بہت تیزی سے پھیلنا شروع ہوئی۔مگر انڈیا کی حکومت کی درخواست پر یوٹیوب نے ہندوستان میں اس

ڈاکومنٹری کو بین کردیا۔یہ علم نہیں کہ اب انڈیا کے ناظرین یوٹیوب پر یہ فلم دیکھ سکتے ہیں یا نہیں۔البتہ میں نے یہ ڈاکومنٹری دل پر بہت جبر کرکے اِسی وقت دیکھی تھی۔اس لیے کہ واقعات کا پس منظر اور پیش منظر اس میں بہت تفصیل سے بیان کیا گیا تھا۔ہندوستان چونکہ اس خطے میں سب سے بڑا ملک ہے لہٰذا ہندوستان کے حالات اور وہاں کی لیڈر شپ کے سوچنے کا اثر یہاں کے تمام لوگوں پر ہوتا ہے۔مزید یہ کہ سماجی پہلوؤں سے جو کچھ ہندوستان میں ہوتا ہے ہمارے ہاں بھی صورتحال کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اس لیے اس مضمون میں ہندوستانی سماج، اشرافیہ اور لیڈر شپ کے بعض پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لینا میرے پیش نظر ہے۔

ہندوستانی سماج اور خواتین

اس ڈاکومنٹری میں بین السطور اور پس منظر میں ہندوستانی سماج کے کئی پہلو نمایاں ہوکر سامنے آئے۔گرچہ ان کے بارے میں دیگر ذرائع سے بھی پہلے ہی بہت سی معلومات موجود ہیں۔پہلی چیز وہی ہے جس کے حوالے سے یہ ڈاکومنٹری بنی ہے۔یعنی ہندوستان میں خواتین کے بارے میں اندازِ فکر اور ان کے ساتھ پیش آنے والے زیادتی کے واقعات جن کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہورہا ہے۔اس حوالے سے یہ بات بہت افسوسناک ہے کہ انڈیا کے دارالخلافہ دہلی کو توریپ کیپیٹل آف انڈیا کا خطاب دیا جاچکا ہے۔مقامی خواتین ہی نہیں بلکہ باہر سے آنے والی مغربی ممالک کی خواتین کو جنسی طور پر ہراساں کرنے اور ان کے ساتھ زیادتی کے واقعات آئے دن میڈیا پر رپورٹ ہوتے ہیں۔

اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ایک بہت اہم سبب خواتین کے بارے میں اندازِ فکر ہے۔ خواتین پر گھریلو تشدد، چہرے پر تیزاب پھینکنا، لڑکوں کو لڑکیوں پر ترجیح دینا عمومی رویے ہیں۔ہندوستان ان ممالک میں شامل ہے جہاں خواتین کی تعداد مردوں کے مقابلے میں کم ہے۔یعنی ہر 1000 مردوں کے مقابلے میں 940 خواتین۔خیال رہے کہ خواتین کی اوسط عمر

زیادہ ہوتی ہے اس لیے عام طور پر ان کی تعداد مردوں سے زیادہ ہی ہوتی ہے۔جبکہ اللہ تعالیٰ کے خصوصی قانون کے تحت مرد اور عورت میں پیدائش کے وقت کم و بیش ایک ہی تناسب ہوتا ہے۔ تاہم ہندوستان میں حمل کے وقت بچیوں کی ایک بڑی تعداد کو ختم کر دیا جاتا ہے۔البتہ لڑکا ہو تو اسے پیدا ہونے دیا جاتا ہے۔یوں سماجی، مذہبی اور معاشی پس منظر کی بنا پر خواتین پہلے ہی کوئی بہت اچھے حالات میں نہیں جیتیں۔

اس پس منظر میں ڈاکومنٹری کا شاید سب سے زیادہ دل دہلانے والا پہلو یہ ہے کہ اجتماعی زیادتی کا ایک مجرم یہ سوال کرتا ہے کہ ہم نے ایسا کون سا کام کیا ہے جس کو اتنا اچھالا گیا اور اس کا اتنا بڑا مدعا بنا دیا گیا۔اس کی بات اس کے سماجی پس منظر میں بالکل ٹھیک ہے کہ ہندوستان میں خواتین کے ساتھ زیادتی عام بات ہے۔متعدد اراکین پالیمنٹ کے خلاف دیگر جرائم کے ساتھ اس جرم پر بھی مقدمات ہیں، مگر وہ مزے سے سیاست کر رہے ہیں۔

ہندوستانی فلموں کی مہربانی

کوئی سماج جب اس بگاڑ پر ہو تو ماس میڈیا یا ابلاغ عامہ کے شعبے کی بڑی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ صورتحال کو بہتر بنائے۔ہندوستان میں وہاں کی فلمیں ابتداء ہی سے ابلاغ عامہ کی سب سے بڑی شکل رہی ہیں۔مگر بدقسمتی سے ہندوستان میں فلم جو کہ تفریح کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، اس میں فحاشی کو اس قدر نمایاں کر کے پیش کیا جاتا ہے کہ دیکھنے والوں پر اس کا بہت برا اثر پڑتا ہے۔فحاشی دنیا بھر کی فلموں میں کسی نہ کسی درجے میں دکھائی جاتی ہے، مگر ہندوستانی فلموں کے ناقدین کا کہنا ہے کہ بے موقع، بے ضرورت اور ہر حال میں عورتوں کی جنسی کشش کو نمایاں کرنے میں جو مہارت ہندوستانی فلم انڈسٹری کو حاصل ہے کوئی اور اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

ظاہر ہے کہ ان چیزوں کے دیکھنے والوں پر اثرات ہوتے ہیں۔ایک طرف سماج ویسے ہی عورتوں کو عزت نہیں دیتا اور دوسری طرف جذبات کو برانگیختہ کرنے والی فلمیں جب عام ہوں گی

تو اس کے نتائج بہر حال نکلیں گے۔اس کی سب سے بڑی قیمت ہندوستانی ناری کو دینا پڑتی ہے۔

ہندوستانی سماج اور غربت

ہندوستانی معاشرے کا ایک اور پہلو جو اس قسم کے حادثات کا باعث بھی ہوتا ہے اور دیگر پہلوؤں سے بھی تباہ کن ہے وہ غربت کا حد سے زیادہ بڑھا ہوا ہونا ہے۔ہندوستان کی ایک تہائی آبادی خط غربت یعنی یومیہ سوا (1.25) ڈالر سے کم کماتی ہے۔انڈیا کی نصف سے زیادہ آبادی کے لیے بیت الخلا یعنی ٹوائلٹ نہیں ہے۔ایک تہائی آبادی کو پینے کا صاف پانی میسر نہیں۔یہ سب کچھ نوے کی دہائی کے بعد سے آنے والی اس معاشی ترقی کے باوجود ہے جس میں انڈیا دنیا کی تیز رفتار ترین معاشی ترقی کرنے والے ممالک میں سے ایک ہے۔مگر یہ ترقی زیادہ تر اپر کلاس یا مڈل کلاس تک محدود ہے۔

اس برس یعنی سن 2015 میں جو گرمیاں پڑی ہیں اس میں ابھی تک ہندوستان میں 2000 سے زائد ہلاکتیں ہو چکی ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ملک کی ایک چوتھائی آبادی کو سرے سے بجلی کی سہولت ہی میسر نہیں۔وہاں پنکھے اور اے سی کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔جبکہ سوا دو کروڑ سے زاید افراد کو گھر کی چھت ہی میسر نہیں۔

ہندوستانی لیڈر شپ اور اشرافیہ

ہندوستانی سماج کے مسائل اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہیں جتنے ہم نے بیان کیے ہیں۔تاہم یہ اس بات کے عکاس ضرور ہیں کہ سوا ارب آبادی کے اس ملک کی قیادت کو اپنے معاملات کے بارے میں اور خاص کر سماجی حالات بہتر بنانے میں کتنا حساس ہونا چاہیے۔مگر دیکھیے کہ ہندوستانی لیڈر شپ کہاں حساس ہے۔

یہ ہندوستان کے عام لوگوں کی بہت بڑی بدنصیبی ہے کہ وہاں عرصے سے ایک ایسی

لیڈرشپ اور اشرافیہ غالب ہے جو زبردست احساس کمتری کا شکار ہے۔اس احساس کمتری کی جڑیں شاید تاریخ میں پیوست ہیں۔ کیونکہ سکندر اعظم سے لے کر مغل حکمرانوں تک اور آخری زمانے میں ابدالی سے لے کر انگریزوں تک باہر سے آنے والے ہندوستان کے مقامی حکمرانوں کو شکست دے کر ان کے ملک پر قبضہ کرتے رہے ہیں۔ یہ دو ہزار برس کی تاریخ ہے جس کے اثر سے شاید ہندوستان کی اشرافیہ نکل نہیں پاتی۔ چنانچہ آزادی کے بعد ہندوستان کی لیڈرشپ نے اپنے عوام کی زندگی بہتر بنانے کے بجائے اپنے ملک میں اسلحے کے انبار جمع کرنے اور دنیا کی ایک بڑی فوجی طاقت بننے کو اپنا مسئلہ بنالیا۔ان سطور کی تحریر کے وقت بھی ایک رپورٹ نظر سے گزری جو اسٹاک ہوم انٹرنیشنل ریسرچ انسٹیٹیوٹ نے شایع کی ہے۔اس کے مطابق ہندوستان دنیا کا سب سے بڑا ہتھیار درآمد کرنے والا ملک ہے۔

ہتھیاروں کی یہ عیاشی وہی قومیں برداشت کرسکتی ہیں جن کی عوام کی حالت زار قابل رشک ہو۔مگر ہندوستان کے عوام کے حالات کا جو ایک بہت مختصر جائزہ ہم نے اوپر پیش کیا ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہاں کے لوگ کس طرح جیتے ہیں۔مگر بدقسمتی سے اس معاملے میں ہندی اشرافیہ کی غیر حقیقت پسندی کا عالم یہ ہے کہ کچھ برس قبل ایک ہندوستانی فلم سلم ڈاگ ملینیر کو بین الاقوامی سطح پر بہت زیادہ پذیرائی ملی۔مگر مجھے اخبارات میں یہ پڑھ کر حیرت ہوئی کہ ہندوستان کے بہت سے لوگوں نے اس پر سخت ناک بھوں چڑھائی کہ ایک ایسی فلم کو پذیرائی کیوں ملی جس میں ہندوستان کی غربت اور مفلسی کو نمایاں کر کے پیش کیا گیا تھا۔اس کے برعکس عام طور پر ہندوستانی فلموں اور ڈراموں میں ہندوستان کی ایک ایسی غیر حقیقت پسندانہ تصویر کشی کی جاتی ہے جس میں اپر کلاس نظر آتی ہے یا پھر ابھرتی ہوئی مڈل کلاس۔ ہندوستانی میڈیا سے تو لگتا ہی نہیں کہ وہاں وہ غربت پائی جاتی ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔وہاں ان غریبوں کو صرف اسی وقت گنا جاتا ہے جب ہندوستان کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریہ ثابت کرنا مقصود ہو۔

ہندوستانی جمہوریت

ہندوستان سماج کی ایک کامیابی جمہوریت کا تسلسل ہے۔ ہندوستانی اشرافیہ بہت فخر سے اس بات کو بیان کرتی ہے۔مگر سوال یہ ہے کہ اس جمہوریت کا کیا فائدہ جس کا جمہور ہی کو کوئی فائدہ نہ ہو۔عوامی ووٹوں سے منتخب ہونے والے اگر عوام کی حالت زار نہ بدلیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ اس نظام کو ذاتی فائدے کے لیے استعمال کررہے ہیں۔اس وقت صورتحال ہے بھی یہی۔

ہندوستانی عوام کی یہ خوبی ہے کہ ان میں عمومی طور پر تحمل اور برداشت کا مادہ پایا جاتا ہے۔مگر ان کی لیڈرشپ عوام کے اس صبر کا ناجائز فائدہ اٹھاتی ہے اور ان کی حالت بدلنے کے بجائے اپنے مفادات کی حفاظت کو ترجیح دیتی ہے۔اس قیادت کا کرپشن اور جرائم میں ملوث ہونا عام بات ہے۔ ایک ایسے ملک میں جس کے جمہوری نظام پر ستر برس گزر چکے ہوں یہ انتہائی تشویشناک بات ہے۔مگر ہندوستانی اشرافیہ اپنے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنے کے بجائے پاکستان اور چین کا ہوا کھڑا کر کے اپنے عوام کے ساتھ بڑی زیادتی کررہے۔ وہ ان میں انتہاپسندی کے بیج بو رہے ہیں۔ یہ بیج ایک روز نہ صرف ہندوستان بلکہ اس خطے کے امن کے لیے سنگین مسئلہ بن جائیں گے۔

اس انتہاپسندی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ پاکستان کے برعکس جہاں کبھی جماعتوں اور انتہاپسند گروپوں کو عوام نے اقتدار نہیں دیا، ہندوستان میں بار بار انتہاپسند جماعتیں اقتدار میں آجاتی ہیں۔

پاکستان پر اثرات

بدقسمتی سے ہندوستان کے ایک بڑی طاقت بننے کے اس جنون کی قیمت پاکستان کو بھی دینا پڑرہی ہے۔ ہندوستان نے نہ صرف حیدرآباد اور جوناگڑھ وغیرہ جیسی ریاستوں پر بھی بزور قبضہ

کرلیا جہاں کے نواب مسلمان تھے بلکہ کشمیر کے ایک حصے پر بھی قبضہ کرلیا جہاں کی آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔اسی کشمیر کی بنا پر اس خطے میں چار جنگیں لڑی جاچکی ہیں۔ بھارت چونکہ پاکستان سے سات گنا زیادہ بڑا ملک ہے اس لیے اس کے مقابلے میں پاکستان کو بہت زیادہ دفاعی اخراجات کرنے پڑتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک ایسے دور میں جب مختلف ممالک علاقائی تعاون کو فروغ دے کر تیزی سے ترقی کررہے ہیں، ہندوستانی اشرافیہ اور لیڈرشپ کے احساس کمتری کی بنا پر اس خطے کے باسی مستقل مسائل کا شکار ہیں۔اس رویے کی سب سے زیادہ قیمت تو بلاشبہ بھارتی عوام دے رہے ہیں۔مگر خطے کے باقی ممالک کے لیے بھی اس وجہ سے شدید مسائل پیدا ہورہے ہیں۔ اب یہ بھارتی عوام کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی لیڈرشپ کا گریبان پکڑیں اور پرفریب جذباتی نعروں کا شکار ہونے کے بجائے عام آدمی کی ترقی کو اپنا نصب العین بنانے والی لیڈرشپ کی تلاش کریں۔وہ یہ اگر نہیں کرتے تو پھر ان کی جمہوریت ان کے لیے بے کار ہے۔

اہل پاکستان کی توجہ کے لیے

آخر میں ایک دو گزارشات اہل پاکستان سے کہ انھیں انڈیا کے عوام کے مسائل پر خوش ہونے کے بجائے یہ دیکھنا چاہیے کہ خود ان کے ملک میں کم وبیش ایسے ہی حالات ہیں۔ یہ ان کی بھی ذمہ داری ہے کہ اپنی لیڈرشپ کا احتساب کریں جو ان کے مسائل حل کرنے کے بجائے کرپشن کر کے دولت کے انبار بڑھائے جارہے ہیں۔

جہاں رہیں بندگان خدا کے لیے باعث رحمت بنیے، باعث آزار نہ بنیے۔

مکاتیب

ابویحییٰ

قرآن مجید میں غلامی کی ممانعت کا حکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ 17/9/14

محترم، غلامی ایک فطری برائی ہے۔کوئی انسان اسے کبھی گوارا نہیں کرسکتا۔ یہ اس قدر فطری برائی ہے کہ جو لوگ اس کے جواز کے قائل ہیں وہ بھی کبھی یہ پسند نہیں کریں گے کہ ان کی بہن، بیٹی اور بیوی یا دیگر قریبی رشتہ دار خواتین کو لونڈیاں بنایا جائے۔اس لیے جو لوگ اس کے جواز کے قائل ہیں میں ان سے پہلے یہ سوال کرتا ہوں کہ کیا وہ اپنی بہن بیٹیوں کے لیے بھی اس برائی کو جائز قرار دیں گے؟ کوئی طاقتور فرد یا گروہ یا غیر ملکی طاقت بالجبر ایسے لوگوں کی خواتین کو اٹھا کر لے جائے تو کیا وہ یہ کہہ کر خاموش بیٹھ جائیں گے کہ بھئی قرآن میں تو لونڈیوں کی ممانعت ہے نہیں۔اس لیے ہم اپنی خواتین کا لونڈی بن جانا قبول کرلیتے ہیں۔

اس لیے اس ناقابل تردید حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ لوگوں کو لونڈی غلام بنانا بدترین ظلم اور جبر ہے۔تاہم بدقسمتی سے تاریخ میں ایک زمانے میں یہ جبر رائج ہوگیا اور ہزاروں برس تک رائج رہا۔قرآن مجید نے اسی کی بتدریج اصلاح کی ہے۔اس کی تفصیل؛ قرآن مجید اور سیرت طیبہ سے اس کے ثبوت اگر آپ کو درکار ہیں تو مولانا امین احسن اصلاحی نے سورہ نور کی تفسیر میں آیہ مکاتبت کے تحت اس کی تفصیل کردی ہے، جسے آپ ان کی تفسیر تدبر قرآن میں دیکھ سکتے ہیں۔مزید تفصیل ہمارے دوست مبشر نذیر صاحب نے غلامی پر لکھی گئی اپنی کتاب میں کردی ہے۔ جسے کوئی سوال ہے وہ ان کی تحقیقات دیکھ لے۔

ہمارے ہاں یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ لونڈیوں کے ذکر سے لوگوں کے منہ میں پانی بھر آتا ہے

اوران کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے۔ وہ نہ قرآن کریم اور سیرت طیبہ کا گہرا فہم رکھتے ہیں نہ اس حقیقت کو سمجھتے ہیں کہ لونڈیاں ہمیشہ کمزوروں کی خواتین کو بنایا جاتا ہے۔ اور یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اس وقت دنیا میں کمزور مسلمان ہیں۔ یہ قانون وحشت اگر دوبارہ لوٹا تو اصل خسارے میں مسلمان رہیں گے۔

والسلام

ابویحییٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ 18/9/14

دیکھیے قرآن مجید چیزوں کو حرام قرار دینے کے لیے دو طریقے اختیار کرتا ہے۔ ایک یہ کہ کسی چیز کا نام لے کر اسے ممنوع قرار دے دیا جائے۔ جیسے قرآن مجید تجسس کی ممانعت کرتے ہوئے کہتا ہے : ولا تجسسوا، (الحجرات 12:49)۔ یعنی تم تجسس نہ کرو۔ دوسرا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ گناہوں کی عمومی کیٹیگری کو ممنوع قرار دے دیا جائے۔ اس کیٹیگری کے ذیل میں آنے والی تمام چیزیں خود ہی ممنوع ہوجاتی ہیں اور قرآن کریم میں ان کی ممانعت کا حکم تلاش کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ مثلاً ایک شخص یہ کہے کہ قرآن پاک میں سور کھانے کی تو ممانعت ہے البتہ سانپ کھانے کی نہیں ہے اس لیے سانپ کھانا جائز ہوگیا۔ یہی معاملہ تمام درندوں اور بول و براز وغیرہ کا ہے۔ آپ کو ان کی ممانعت کا براہ راست حکم قرآن مجید میں نہیں ملے گا۔

ایسی چیزوں کی حرمت میں جیسا کہ بیان ہوا کہ قرآن مجید کا طریقہ یہ ہے کہ عمومی کیٹیگری بیان ہوجاتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید نے اسی اصول پر خبائث کو حرام قرار دیا ہے اور فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کھانے پینے کے لیے صرف طیبات ہی حلال قرار دیے ہیں، (المائدہ 5:5)۔ چنانچہ سانپ، شیر، چیتے اور بول و براز وغیرہ اس وجہ سے حرام ہوجاتے ہیں کہ انسان

ان کو فطری طور پر خبیث چیزوں کے طور پر جانتا ہے۔ خیال رہے کہ استثنائی طور پر اگر کوئی واقعہ اس نوعیت کا ہوجائے تو اس سے ان کی فطری حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

حرمت کی ایسی ہی ایک کیٹیگری وہ ہے جس میں قرآن بغی یا زیادتی کو ممنوع قرار دیتا ہے، (اعراف 33:7)۔ اب اس کے بعد ضروری نہیں رہتا کہ قرآن مجید ظلم کی ہر قسم کا نام لے کر یہ بیان کرے کہ فلاں زیادتی ناجائز ہے اور فلاں ظلم حرام ہے۔ بلکہ انسانی فطرت اور معاشرے جس جس چیز پر ظلم کا اطلاق کرتے ہیں وہ خود بخود اسی اصول پر حرام ہوجائے گا۔ کسی انسان کی آزادی کو سلب کرکے اسے غلام بنالینا اسی نوعیت کی چیز ہے۔ چنانچہ غلامی اسی اصول پر حرام ہے کیونکہ اس میں لوگوں کی آزادی پر حملہ کرکے اوران کی عزت اور آزادی پامال کرکے انھیں غلام بنایا جاتا ہے، بالجبران سے مشقت لی جاتی ہے اور دیگر طریقوں سے انھیں ظلم کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ چنانچہ غلامی ہر حال میں ایک برائی تھی اور اسے گوارا کرنا اسلام کے لیے کسی طور ممکن نہ تھا۔ مگر جیسا کہ بار بار بیان ہوتا ہے کہ یہ برائی اتنی زیادہ پھیل چکی تھی کہ نہ صرف اس کی برائی کا تاثر ختم ہوچکا تھا بلکہ پورا معاشرتی نظام اسی پر منحصر ہوچکا تھا اس لیے دین اسلام نے اس برائی کے خاتمے میں تدریج کا طریقہ اختیار کیا۔ اسلام دین فطرت ہے۔ وہ برائی کو بھی غیر فطری طریقے پر ختم نہیں کرتا۔

چنانچہ جو لوگ آج غلامی اور خاص کر خواتین کو لونڈی بنا کر ان سے استفادہ کے قائل ہیں اور اس کے لیے یہ دلیل دیتے ہیں کہ قرآن میں غلامی کے خاتمے کا کوئی حکم نہیں وہ سرتاسر غلطی پر ہیں۔ قرآن مجید ظلم و زیادتی کی ہر قسم کو حرام کرتا ہے۔ غلامی اس ظلم کی بدترین شکل ہے اور اس کا دوبارہ شروع کرنا ایک بدترین جرم ہے۔

والسلام

ابویحییٰ

<u>سوال وجواب</u>

ابویحییٰ

ایمان اور نکاح کا ختم ہونا

<u>سوال:</u> السلام علیکم

میں نے ایک آڈیو کلپ وٹس ایپ کے ایک گروپ میں شیئر کیا۔ بہت سی خواتین یہ جاننا چاہتی ہیں کہ وہ کون سے حرام کلمات ہیں جن کے ادا کرنے سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔ برائے کرم کچھ رہنمائی فرما دیجیے۔ فرح رضوان

<u>جواب:</u> معاف کیجیے گا کہ جواب میں تاخیر ہوئی۔ دراصل آڈیو سننے کا سوچا تھا مگر اس کا وقت نہیں مل سکا۔ اب صرف آپ کے سوال کا جواب دے رہا ہوں۔

آپ غالباً ان چیزوں کے بارے میں پوچھ رہی ہیں جن کو ہمارے ہاں اصطلاحاً کلمات کفر کہا جاتا ہے اور جن کے بعد انسان کو دائرہ اسلام سے خارج اور اس کا نکاح باطل سمجھا جاتا ہے۔

میری ناقص رائے میں ایمان ہو یا نکاح وطلاق، ان کے ہونے نہ ہونے کا قطعی طریقہ دین میں بیان کر دیا گیا ہے۔ جو اس نوعیت کے کلمات لوگ اپنی زبان سے نکالتے ہیں، وہ اگر غلط ہیں تو ان کو زبان سے نہیں نکالنا چاہیے۔ مگر ان کو غیر شعوری طور پر زبان سے نکالنے سے ایمان اور پھر نکاح کیسے ختم ہوسکتا ہے؟ ایک غلطی سے جو نادانستگی میں ہو جائے ایمان کا خاتمہ سمجھ میں نہیں آتا۔ ہاں الفاظ اگر غلط ہیں تو ان کو نہیں ادا کرنا چاہیے۔ مگر اس طرح کی چیزوں کا ایمان اور نکاح وطلاق سے کوئی تعلق نہیں۔

پھر یہ بھی سمجھ لیں کہ بعض چیزیں اطلاقی ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ خود قرآن میں کہتے ہیں کہ اللہ کا ہاتھ یا اللہ آسمان پر ہے۔ یہی معاملہ بعض روایات کا ہے جن میں ایسی ہی تعبیرات آئی ہیں۔

ہمارے ہاں تو ایسی باتیں کفر بن جاتی ہیں لیکن دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ ذہن انسانی کی رعایت کر کے ان تعبیرات کو اختیار کر رہے ہیں۔ اتنے بڑے فتوے دینے سے قبل کسی بات کا پورا پس منظر سمجھنا چاہیے۔ اس کے بعد اس کا صحیح وغلط طے ہوگا۔ مگر پھر بھی اس کا ایمان وکفر اور نکاح وطلاق سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کا طریقہ دین میں بیان کر دیا گیا ہے۔ ھذا ماعندی واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت سلیمان کی ہدہد سے گفتگو

<u>سوال:</u>

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت سلیمان علیہ السلام اور ہدہد کی گفتگو کا ذکر ہے قرآن میں، میں اس کی عقلی توجیہ تلاش کرنے سے قاصر ہوں۔ مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی کہ کیا چرند پرند بھی ہماری طرح عقل رکھتے ہیں؟ اور کیا وہ بھی اسی طرح منطقی انداز میں کمیونیکیٹ کرتے ہیں جیسے کہ انسان کرتے ہیں؟ ملحدین اس قرآنی واقعہ پر شدید اعتراض کرتے ہیں۔ عرفان رشید

<u>جواب</u>

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

پہلی بات یہ ہے کہ ہم جانوروں کی استعداد اور صلاحیت کے بارے میں ابھی تک پوری طرح نہیں جانتے۔ جب ہم جانتے ہی نہیں تو قرآن مجید کے ان بیانات کی کس بنیاد پر تردید کر سکتے ہیں جو ہدہد یا چیونٹی کے حوالے سے بیان ہوئے ہیں۔ یہ تردید تو کوئی ایسا شخص ہی کر سکتا ہے جو حضرت سلیمان کی طرح پرندوں کی بولیاں سمجھ سکتا ہو اور وہ پورے اعتماد سے یہ کہے کہ

جانور تو یہ کام کر ہی نہیں سکتے۔اس لیے اس کا ہونا غیر عقلی ہے۔

باقی رہی حضرت سلیمان علیہ السلام کی پرندوں سے گفتگو کی صلاحیت تو اس میں یہ جان لینا چاہیے کہ پرندے اور جانور آپس میں کمیونیکیٹ کرتے ہیں یہ ایک اب مانی ہوئی بات ہے۔ایک حد تک تو وہ سارے لوگ جو جانوروں کو پالتے اور ان کو تربیت دیتے ہیں ان سے کمیونیکیٹ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔اس پر قرآن مجید کا اضافہ صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو ساری مخلوق کے خالق ہیں انھوں نے حضرت سلیمان کو پرندوں کی گفتگو کا ملکہ عطا کر دیا تھا۔پیغمبروں کو معجزے عطا ہوتے رہے ہیں۔سیدنا عیسیٰ مردوں کو زندہ کر دیتے تھے۔یہ کون سی عقل میں آنی والی بات ہے۔ معجزہ کہتے ہی اسی چیز کو ہیں جو عقل کو عاجز کر دے اور اسباب سے بلند کوئی معاملہ کیا جائے۔

جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ کوئی شخص معجزات کو ہی نہیں مانتا تو اس سے سوال کیا جائے گا کہ کیا دو صدی پہلے تک یہ ممکن تھا کہ ایک شخص ایک جگہ بیٹھ کر بات کرے اور دوسرے براعظم کے لوگ اسی وقت اس کی آواز سنیں اور شکل دیکھیں۔یہ آج ممکن ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ علم کی بلند تر سطح پر جا کر معجزات معقولات میں داخل ہو جاتے ہیں۔ایک خاص حد تک آپ کو علم مل جائے تو آپ بھی وہ کام کر سکتے ہیں جو دوسرے کے لیے معجزات کی حیثیت رکھتے ہیں۔اللہ تعالیٰ چونکہ علم کی بلند ترین سطح پر ہیں اس لیے جب چاہیں جس کو چاہیں کوئی معجزہ عطا کر دیں۔گویا معجزہ کا مطلب صرف اتنا ہے کہ وہ اپنی قدرت اور علم میں سے کسی کو کچھ حصہ عطا کر دیتے ہیں جس کے بعد معجزے رونما ہو جاتے ہیں۔یہ معجزہ انسانوں کے لحاظ سے ہوتا ہے۔اللہ کی تو یہ قدرت اور علم کا کرشمہ ہوتا ہے۔اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔باقی رہے ملحدین تو انھیں اصل اعتراض خود اللہ میاں کے ہونے پر ہے۔ان سے کہیں کہ پہلے یہ مسئلہ حل کر لیں، حضرت سلیمان پر بعد میں آئیں۔

کیا طوفان نوح عالمی تھا؟

سوال

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کیا حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر جو سیلاب آیا وہ لوکل تھا یا گلوبل؟ کیا اس کے کوئی تاریخی شواہد موجود ہیں؟

عرفان رشید

جواب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر جو سیلاب آیا اس کی نوعیت عالمی تھی یا مقامی اس پر صاحب تفہیم القران نے سورۃ الاعراف کی آیت 59 کی تفسیر میں اپنا یہ نقطہ نظر بیان کیا ہے کہ یہ سیلاب عالمی نوعیت کا نہ تھا بلکہ یہ سیلاب آپ کی قوم پر آیا اور اس وقت پوری نسل آدم کسی ایک ہی خطے میں رہتی تھی اس لیے مختلف اقوام کی تاریخی روایات میں اس کا ذکر ہے۔ان کی پوری بات درج ذیل ہے۔

قرآن کے ارشادات اور بائیبل کی تصریحات سے یہ بات متحقق ہو جاتی ہے کہ حضرت نوحؑ کی قوم اُس سرزمین میں رہتی تھی جس کو آج ہم عراق کے نام سے جانتے ہیں۔بابل کے آثارِ قدیمہ میں بائیبل سے قدیم تر جو کتبات ملے ہیں ان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، اُن میں تقریباً اُسی قسم کا ایک قصہ مذکور ہے جس کا ذکر قرآن اور تورات میں بیان ہوا ہے اور اس کی جائے وقوع موصل کے نواح میں بتائی گئی ہے۔پھر جو روایات کُردستان اور آرمینیہ میں قدیم ترین زمانے سے نسلاً بعد نسلٍ چلی آ رہی ہیں اُن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ طوفان کے بعد حضرت نوح کی کشتی اسی علاقہ میں کسی مقام پر ٹھہری تھی۔موصل کے شمال میں جزیرہ ابنِ عمر کے آس

پاس، آرمینیہ کی سرحد پر کوہِ اراراط کے نواح میں نوحؑ کے مختلف آثار کی نشان دہی اب بھی کی جاتی ہے، اور شہر نخچیوان کے باشندوں میں آج تک مشہور ہے کہ اِس شہر کی بنا حضرت نوحؑ نے ڈالی تھی۔

حضرت نوحؑ کے اس قصے سے ملتی جُلتی روایات یونان، مصر، ہندوستان اور چین کے قدیم لٹیریچر میں بھی ملتی ہیں اور اس کے علاوہ برما، ملایا، جزائرشرق الہند، آسٹریلیا، نیوگنی اور امریکہ و یورپ کے مختلف حصوں میں بھی ایسی ہی روایات قدیم زمانہ سے چلی آرہی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قصہ اُس عہد سے تعلق رکھتا ہے جبکہ پوری نسلِ آدم کسی ایک ہی خطہ زمین میں رہتی تھی اور پھر وہاں سے نکل کر دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلی۔ اسی وجہ سے تمام قومیں اپنی ابتدائی تاریخ میں ایک ہمہ گیر طوفان کی نشان دہی کرتی ہیں، اگرچہ مرورِ ایام سے اس کی حقیقی تفصیلات انہوں نے فراموش کر دیں اور اصل واقعہ پر ہر ایک نے اپنے اپنے تخیل کے مطابق افسانوں کا ایک بھاری خول چڑھا دیا۔ (2/40)

فرح رضوان

ایک دوست کے احوال سفر

کئی سال پہلے ہم ایک اسلامی ملک میں مقیم تھے، اسلامی ممالک میں جو کچھ تیسرے درجے کے شہری کے ساتھ ہوتا ہے وہ سب بھگت کر تھک چکے تھے، کہ شکر ہے کینیڈا کے پیپرز آگئے، لیکن وہاں جانے کے انتظامات میں تاخیر کچھ زیادہ ہی ہوگئی، اور شدید رش کا سیزن آگیا۔ اب سیٹ ملنا دشوار ہی نہیں ناممکن ہو چلا تھا کہ خوش نصیبی سے ڈیڈ لائن سے کچھ دن پہلے دو سیٹس مل گئیں۔ میاں تو خیر پہلے ہی وہاں جا کر ہمارے لیے رہائش کا بندوبست کر کے آچکے تھے اب ان کو یہاں سب سمیٹنا تھا۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب جہاز میں ایک شخص دو ہینڈ کیری لے کر جا سکتا تھا، لہٰذا دو عدد میرے پاس، دو بیٹے کے پاس تھے، لیکن جوں ہی ہم بورڈنگ کے لیے لائن میں لگے پتہ چلا کہ پچھلے ہفتے قانون بدل چکا ہے۔ اب سے صرف ایک ہی ہینڈ بیگ جا سکتا ہے۔ سوٹ کیس تو پہلے ہی بمشکل بند کیے تھے، ان کو سرِ راہ کھولنا ایک بدترین حماقت ثابت ہوتی۔ جب بحث مباحثہ منت سماجت کسی کام نہ آئی تو ہم نے ہار مان کر گھٹنے ٹیک دیے۔ اور ایک بیگ جس کا وزن بھی بہت تھا اور جس میں قرآن کریم بھی تھا، میاں کو دے دیا۔

پھر جلدی سے بورڈنگ پاس لیا تو پتہ چلا کہ ائیر پورٹ کے آخری سرے پر ہمارا گیٹ ہے تو پھر لگائی دوڑ...... اتنا دوڑے کہ سانس پھول گیا۔ گیٹ پر پہنچے تو وہ بند ملا اور اتنے شور میں ایک اناؤنسمینٹ پر کان کھڑے ہوئے کہ گیٹ بدل گیا ہے۔ اب واپس الٹا دوڑنا تھا۔ اگلے لمحے ہم پھر بھاگنا شروع ہو گئے اور اللہ اللہ کر کے گیٹ کھلنے سے کچھ منٹ قبل لاؤنج تک پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گئے، یوں لگا جیسے تمام تر توانائی خرچ کر کے جیت اپنے نام کر لی ہو۔

جب سانس بحال ہوئی تو میں نے بیٹے سے کہا کہ ہمیں اب وقت سے پہلے ہی آرگنائز ہو جانا چاہیے، پاسپورٹ کا کام تو ہو چکا لینڈنگ پیپرز اوپر کی طرف رکھ لیتے ہیں، لینڈنگ پیپرز؟......اوہ ہ ہ خدایا!!!! وہ تو اس بیگ میں ڈال دیے تھے جو میاں کو دیا تھا۔اب دماغ پر تابڑ توڑ سوالات کی بوچھاڑ سے ذہن ماؤف ہو چلا تھا۔

آخر کار بھرے ہوئے جہاز سے ہمارا سامان آف لوڈ کر دیا گیا۔ بے بسی اور ریجیکشن کا عجیب احساس ذلت تھا، لیکن اللہ کا احسان کہ اسی کاؤنٹر پر اس سٹاف نے ہماری ایک دن بعد کی فلائٹ بک کر دی، میں تو کافی حواس باختہ تھی لیکن بیٹے کو یاد تھا تو اس نے سیٹس کے ساتھ ہی حلال فوڈ کی ریکویسٹ بھی شامل کی جو انہوں نے ہمارے سامنے اوکے کی، بہر حال اس شہر میں بھی ابھی کچھ رزق باقی تھا سو اپنا سامان لیا اور واپس گھر روانہ ہو گئے، راستے بھر، ٹکٹ مل جانے پر شکر تو کیا ہی لیکن ساتھ ہی کچھ باتوں کی بازگشت ذہن میں گونجتی رہی کہ ذرا سا excess baggage ...... دنیا میں اتنے دکھ، ذلت اور محنت کے اکارت ہونے کا سبب بن گیا،...... دنیا کے صرف ایک قاعدے یا قانون سے نہ واقفیت کا اتنا نقصان اٹھانا پڑا۔ اس روز کیا ہوگا جب بات ہمیشہ ہمیشہ کی ہوگی اور اس سے کہیں زیادہ سخت گیر فرشتے حشر کے میدان میں تعینات ہونگے ؟......ذہن میں یہ باتیں جاری تھیں کہ گھر آ گیا، میں نے پہلی فرصت میں قرآن والے بیگ کی کچھ کتابیں نکال کر اسے لے جانے کے لیے تیار کیا اور ایک دن کے وقفے کے بعد پھر سفر کا آغاز ہوا، یوں تو میں نے اپنی حرکت پر بہت توبہ بھی کی تھی اور امید ہے کہ قبول بھی ہوئی ہوگی کہ اللہ رب العزت نہایت مہربان ہے۔

بہر حال چوبیس گھنٹے کا سفر مکمل ہوا اور منزل مقصود پر پہنچ گئے، اور دیکھا جائے تو یہاں پہنچ کر اصل اندازہ ہوا کہ شکر ہے ہم بنا لینڈنگ پیپرز کے یہاں نہیں آ گئے، کیونکہ یہاں مختلف کمروں

میں لوگوں کے انٹرویو ہو رہے تھے اور جن لوگوں کے ''نامۂ اعمال'' میں ذرا بھی گڑ بڑ تھی ان کو ڈانٹ پھٹکار کر جہنم رسید کیا جا رہا تھا'' اور ہم تو سرے سے نامہ اعمال یعنی پیپرز کے بغیر ہی روانہ ہو چلے تھے، نہ جانے ہمارا کیا حشر ہوتا''۔

ہم ان لوگوں میں سے تھے جو سالہا سال میں اتفاق سے کوئی ایک لیکچر سن لیا کرتے ہیں، یا کچھ خاص سورتیں خاص مقاصد کے حصول کے لیے پڑھ لیں، علم یعنی دین کو جاننے کی نہ تو اہمیت جانی تھی، نہ ضرورت سمجھی نہ خواہش جاگی تھی، الحمد للہ مسلمان ہونے کے ناطے قرآن کی سچائی اور برکت پر تو مکمل ایمان تھا۔لیکن فیوض اور برکات کا درست علم بھی نہ تھا اور اس سے دوری اور اعراض برتنے کے نقصانات سے واقفیت بھی نہ تھی، نہ ہی اس بات کی وضاحت کہ قرآن کو محض پڑھنا ہی نہیں ہوتا اس پر عمل بھی کرنا ہوتا ہے، یعنی پڑھنا اور عمل کرنا ملا کر تلاوت کہلاتا ہے۔لیکن اس سفر کے بعد الحمد للہ بہت سی بہتر تبدیلیاں آتی گئیں۔

کئی سال ہو چکے ہیں، لیکن الحمد للہ اب تک صرف یاد ہی نہیں ہے، بلکہ اکثر نئے نئے زاویے سے اس سے سبق ملتے رہتے ہیں۔خاص کر سورۃ الاعراف کی تلاوت کے دوران بیشمار مقامات پر اور مفتی مینک کے "excess baggage" کے عنوان سے ایک لیکچر کے دوران تو لگا کہ میرے ہی سفر کی بات ہو رہی ہے۔

منفی انسان کو ہر موقع میں ایک مشکل نظر آتی ہے
مثبت انسان ہر مشکل میں ایک موقع دیکھتا ہے (ابویحییٰ)

ابویحییٰ

مضامین قرآن (20)

دلائل توحید: ربوبیت

ربوبیت کا مطلب وہ کائناتی انتظام ہے جو اس کائنات میں زندگی کو وجود میں لانے، اسے برقرار رکھنے، اس کی ترقی اور تنوع کا سلسلہ جاری رکھنے، کائناتی طاقتوں اور حوادث سے اسے تحفظ دینے سے عبارت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نسبت سے ربوبیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ اگر ہمارے مالک ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے ہم کو وجود بخشا۔ ان ہی کی عطا کردہ نعمتوں کی بنا پر ہمارا وجود ماں کے پیٹ میں ایک خلیہ کی شکل میں اپنا سفر شروع کرتا ہے۔ ایسا خلیہ جو سوئی کی نوک سے زیادہ باریک ہوتا ہے۔ اس محفوظ مقام پر وہ قدم بقدم ہم کو مختلف مراحل سے گزارتے ہوئے ایک پورا انسان بناتے ہیں۔ پھر ہم دنیا میں اس حال میں آتے ہیں کہ نہ دانت ہوتے ہیں کہ کھا سکیں، نہ اعضا و جوارح میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ حصول خوراک، موسموں کی شدت سے بچنے اور زمانے کے سرد و گرم سے اپنے تحفظ کی جدوجہد کر سکیں۔ مگر وہ ہمارے گرد رشتے ناطوں کا ایسا محفوظ حصار باندھتے ہیں جو حوادث زمانہ سے ہماری حفاظت کرتا اور ہماری ہر ضرورت کا بندوبست کرتا ہے۔ جو اس کے بس کی بات نہیں ہوتی اس کا انتظام ہمارا خالق انتہائی آسان اور محفوظ طریقے پر اس طرح کرتا ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال ہماری خوراک ہے۔ ایک نومولود کے لیے اس کی ماں کا وجود جو خون اور گوشت کا مجموعہ ہوتا ہے حیرت انگیز طور پر دودھ جیسی پاکیزہ اور لطیف خوراک کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ جب تک بچے کی ضرورت ہوتی ہے خون کی جگہ ماں کے وجود سے دودھ کی فراہمی جاری رہتی ہے اور جب

ضرورت ختم ہو جاتی ہے تو یہ سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔

یہی معاملہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر زندگی بھر جاری رہتا ہے۔ نعمتوں کی یہ برسات صرف ہماری ضروریات کی فراہمی تک محدود نہیں بلکہ آسائش، لذت اور ذوق جمال کی بھی بھرپور تسکین کرتی ہے۔ انسان جب شیر خوارگی کی عمر سے نکلتا ہے تو نشوونما کے لیے خوراک کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ یہ خوراک سخت دانتوں کے بغیر معدے تک پہنچنا ممکن نہیں۔ چنانچہ خوراک کو کچلنے والے دانتوں کی فصل منہ میں اگ جاتی ہے۔ پتھر سے زیادہ سخت اس فصل کے بیچ وہ نرم و نازک زبان ہوتی ہے جو انواع و اقسام کے ذائقوں کی لذت سے انسانی وجود کو لذت و سرور بخشتی ہے۔ انسان شباب کی عمر کو پہنچتا ہے تو جسم میں خود بخود وہ تبدیلیاں رونما ہو جاتی ہیں جو اسے اس قابل بنا دیتی ہیں کہ وہ صنف مخالف کے ساتھ مل کر اولاد جیسی نعمت کو حاصل کر سکے۔ مگر یہاں بھی حیاتیاتی ضرورت کے ساتھ ذوق جمال کی تسکین کا جو اہتمام کیا گیا ہے، اس سے بھی ہر انسان واقف ہے۔

بقا اور ارتقا کا یہ نظام وجود ہی میں نہیں آسکتا اگر پوری کائنات کو مسخر کر کے زندگی کے حق میں ہموار نہ کیا جائے۔ سورج اگر چمکنا بند کر دے، چاند اگر نکلنا چھوڑ دے، آسمان اگر برسنا روک دے، دھرتی اگر اپنا سینہ شق کر کے فصل نہ اگائے، دن اور رات کا سلسلہ اگر اپنی گردش بند کر دے اور ان جیسے ہزاروں لاکھوں انتظامات میں سے ایک بھی اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو زندگی اپنا وجود کھو دے گی۔ یہ صرف اللہ پروردگار عالم کی ہستی ہے جو اپنی قوت سے تمام کائنات کو انسان کے لیے رزق کا دسترخوان بنا دیتے ہیں۔

انسانیت کا المیہ: حواس پرستی

یہ سارے اہتمام اس انسان کے سامنے ہیں جو پتھر نہیں ہے کہ کسی کی مہربانی پر نہ پگھلے۔ جو

کوئی جانور نہیں ہے کہ احسان کے جواب میں بندگی کے ڈھنگ نہ جانتا ہو۔انسان ایک حساس اور باذوق ہستی ہے۔وہ عنایت کا مطلب سمجھتا ہے۔وہ عطا اور بخشش کی زبان کو جانتا ہے۔وہ لطف وکرم کو محسوس کر لیتا ہے۔پھر اس کا وجود سراپا اعتراف بن جاتا ہے۔اس کی ہستی سراپا شکر بن جاتی ہے۔

پھر انسان صاحب احساس ہی نہیں صاحب ادراک بھی ہے۔وہ محسوس ہی نہیں کرتا سوچتا بھی ہے۔اسے عقل وفہم کی صلاحیت دی گئی ہے۔یہ صلاحیت جو ایک طرف اپنی ذات میں سب سے بڑی نعمت ہے، ایک دوسرے پہلو سے اس کے سامنے یہ سوال رکھ دیتی ہے کہ کون ہے جس نے زندگی سے محروم اور آگ، گیسوں، پتھروں، خلا پر محیط اس کائنات میں انسان کے لیے زمین کو گہوارا اور آسمان کو ایک محفوظ چھت بنادیا ہے۔پھر فرش تا عرش انعام واحسان کے وہ انبار رکھ دیے ہیں جنھیں دیکھ کر کوئی ذی ہوش اور ذی شعور انسان بے پروا اور بے نیاز ہوکر نہیں گزر سکتا۔مگر ہزارہا برس پر محیط انسانی تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان نے دنیا میں موجود ان تمام مہربانیوں کے معاملے میں اپنی عقل کو ایک کونے میں رکھ کر صرف اور صرف حواس پرستی کا مظاہرہ کیا۔صرف اس بنیاد پر کہ یہ سب کچھ دینے والا نظر نہیں آتا وہ اپنی بندگی کا نذرانہ انسانوں، پتھروں اور دیگر مخلوقات کی جھولی میں ڈالتا رہا۔

ربوبیت کے سوال کا جواب: بندگی، اعتراف اور شکر

حقیقت یہ ہے کہ انسانیت کا سب سے بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ خدائے واحد کے معاملے میں وہ نہ اعتراف کر سکا نہ شکر۔خدا کا اعتراف یہ تھا کہ اس کو ایک مانا جائے۔ہر عطا کو اس کی جانب منسوب کیا جائے۔شکر یہ تھا کہ تنہا اللہ ہی کی عبادت کی جائے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے۔کیونکہ اس کے سوا نہ انسان کا کوئی خالق ہے نہ انسان کا کوئی ان داتا۔وہی عطا کرنے والا

اور وہی دینے والا۔مگر انسانیت نے شیطان کے بہکاوے میں آکر اپنے ساتھ یہ ظلم کیا کہ سب کچھ دینے والے کو بندگی کا ایک سجدہ تک دینا گوارا نہ کیا۔اس کا دل ہمیشہ مخلوقات میں اٹکا رہا۔انسانوں نے ہر ہر مخلوق کو پوجا مگر خدا کو نہ پوجا۔سب کی عظمت کا اعتراف کیا۔نہ کیا تو رب کائنات کی یکتائی کا اعتراف نہ کیا۔

یہ انسانیت کے دور طفولیت کا معاملہ تھا۔مگر آج جب انسانیت اپنے پورے شعور کو پہنچ چکی ہے تو اس نے اپنی عقل کا ایک دوسرے طریقے سے مذاق اڑایا ہے۔پہلے زمانے کے لوگ خدا کو مانتے تھے۔اسے ایک ماننے کو تیار نہ تھے۔وہ خدا کو رب مانتے تھے، مگر اس کے بیٹے بیٹیاں تخلیق کر کے اپنی بندگی کا ہر جذبہ ان آسمانی اولادوں کی خدمت میں پیش کر دیتے تھے۔مگر دور جدید کا انسان ساری نعمتوں کو دیکھتا اور سمجھتا ہے، مگر دینے والے کے وجود کا منکر ہو گیا یا پھر اس سے غافل ہو کر دنیا ہی میں اپنی جنت بنانے میں مشغول ہو گیا ہے۔مگر نہ پہلا رویہ درست تھا اور نہ یہ دوسرا رویہ۔

یہ قرآن کریم ہے جو انسانیت کو بتاتا ہے آسمان سے لے کر زمین تک پھیلی نعمتوں کی اس عظیم بادشاہی کا رب اللہ پروردگار عالم ہے۔وہی تنہا ہر نعمت کا دینے والا اور ہر مہربانی کو جنم دینے والا ہے۔یہ اس کا حق ہے کہ اس کے ہونے، ایک ہونے اور تنہا رب ہونے کا اعتراف کیا جائے۔یہ انسان کا فرض ہے کہ اس ایک رب کی عبادت کرے اور اسی کی بندگی کو اپنی زندگی بنائے۔یہ بندگی جیسا کہ پیچھے بیان ہوا دو چیزوں سے عبارت ہے ایک اعتراف اور دوسرے شکر۔یہی بندگی کی وہ دعوت ہے جسے لے کر قرآن مجید آیا ہے اور اس کی سب سے بڑی دلیل ربوبیت ہے کہ انسان ایک نعمت بھری دنیا میں جی رہا ہے۔یہ دنیا نہ انسان نے پیدا کی۔نہ مخلوق میں سے کسی اور نے پیدا کی اور نہ خود بخود وجود میں آئی ہے۔یہ اللہ واحد و لاشریک کی تخلیق ہے

اور اپنی اس تخلیق پر وہ اعتراف، شکر اور بندگی کا مستحق ہے۔

ربوبیت: دلیل توحید اور دلیل آخرت

ربوبیت بیک وقت دلیل توحید بھی ہے اور دلیل آخرت بھی۔ توحید کی دلیل اس پہلو سے ہے کہ انسان کی عقل اور اس کی فطرت اسے یہ بتاتی ہے کہ جس نے نعمت دی ہے، اس کا احسان ماننا ایک لازمی عقلی اور اخلاقی تقاضہ ہے۔ آخرت کی دلیل یہ اس پہلو سے ہے کہ انسان نے اپنے لیے اس دنیا میں جو نظام قائم کر رکھا ہے وہ ٹھیک اسی اصول پر ہے کہ کارخانہ اگر لگایا گیا ہے اور ملازموں کی ہر ضرورت کو اس میں پورا کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے تو لازمی ہے کہ دیکھا جائے کہ کس نے مطلوبہ کام کیا۔ جس نے اہتمام کیا ہے وہ احتساب بھی کرے گا۔

قرآن کریم میں ربوبیت کی یہ دلیل ان دو پہلوؤں سے بار بار استعمال کی گئی ہے۔ کبھی صاف طور پر بتا دیا گیا ہے کہ نعمت کی شکر گزاری اور پھر اس کے بعد احتساب لازمی ہے اور کبھی نعمتوں پر توجہ دلا کر عقل انسان کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ ان نشانیوں پر غور کرے اور اپنے لیے درست لائحہ عمل خود بنائے۔

قرآنی بیانات:

اے لوگو، بندگی کرو اپنے اس خداوند کی جس نے تم کو بھی پیدا کیا اور ان کو بھی جو تم سے پہلے گزرے ہیں، تاکہ دوزخ کی آگ سے محفوظ رہو۔ اس کی بندگی، جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور اتارا آسمان سے پانی اور اس سے پیدا کیے پھل تمہاری روزی کے لیے۔ تو تم اللہ کے ہمسر نہ ٹھہراؤ اور آں حالے کہ تم جانتے ہو۔

(البقرہ 2 :22-21)

''بے شک اللہ ہی دانے اور گٹھلیوں کو پھاڑنے والا ہے۔ وہ برآمد کرتا ہے زندہ کو مردہ سے اور وہی برآمد کرنے والا ہے مردہ کو زندہ سے، بس وہی اللہ ہے تو تم کہاں اوندھے ہوئے جاتے

ہو! وہی برآمد کرنے والا ہے صبح کا اور اس نے رات سکون کی چیز بنائی اور سورج اور چاند اس نے ایک حساب سے رکھے۔ یہ خدائے عزیز و علیم کی منصوبہ بندی ہے اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے ستارے بنائے تاکہ تم ان سے خشکی اور تری کی تاریکیوں میں رہنمائی حاصل کرو۔ ہم نے اپنی نشانیاں ان لوگوں کے لیے تفصیل سے بیان کر دی ہیں جو جاننا چاہیں اور وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ایک ہی جان سے پھر ہر ایک کے ایک مستقر اور ایک مدفن ہے، ہم نے اپنی نشانیاں ان لوگوں کے لیے تفصیل سے بیان کر دی ہیں جو سمجھیں۔ اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا، پھر ہم نے اس سے ہر چیز کے انکھوے نکالے، پھر ہم نے اس سے سرسبز شاخیں ابھاریں جن سے ہم تہ بہ تہ دانے پیدا کر دیتے ہیں اور کھجور کے گابھے سے لٹکتے ہوئے گچھے اور انگوروں کے باغ اور زیتون اور انار، باہمدگر ملتے جلتے بھی اور ایک دوسرے سے مختلف بھی۔ ہر ایک کے پھل کو دیکھو جب وہ پھلتا ہے اور اس کے پکنے کو دیکھو جب وہ پکتا ہے۔ بے شک ان کے اندر نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لانا چاہیں۔ اور انہوں نے جنوں میں سے خدا کے شریک ٹھہرائے حالانکہ خدا ہی نے ان کو پیدا کیا اور (انہوں نے) اس (خدا) کے لیے بے سند بیٹے اور بیٹیاں تراشیں، وہ پاک اور برتر ہے ان چیزوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ (انعام6:100-95)

اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور بادلوں سے پانی اتارا پھر اس سے مختلف قسم کے پھل تمہارے رزق کے لیے پیدا کیے اور کشتی کو تمہاری نفع رسانی میں لگا دیا تاکہ وہ سمندر میں اس کے حکم سے چلے اور اس نے دریاؤں کو بھی تمہاری نفع رسانی میں لگا دیا اور سورج اور چاند کو بھی تمہاری نفع رسانی میں لگا دیا، دونوں ایک ہی انداز پر گردش میں ہیں اور دن اور رات کو بھی۔ اور تم کو ہر اس چیز میں سے بخشا جس کے تم طالب بنے۔ اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو گے تو ان کو شمار نہ کر پاؤ گے۔ بے شک انسان بڑا ہی حق تلف ناشکرا ہے۔

(ابراہیم14:34-32)

اس نے انسان کو پانی کی ایک بوند سے پیدا کیا تو وہ ایک کھلا ہوا حریف بن کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور چوپائے بھی اس نے تمہارے لیے پیدا کیے جن کے اندر تمہارے لیے گرم لباس بھی ہے اور دوسری منفعتیں بھی اور ان سے تم غذا بھی حاصل کرتے ہو۔ اور ان کے اندر تمہارے لیے ایک

شان بھی ہے جب کہ تم ان کو شام کو گھر واپس لاتے ہو اور جس وقت کہ ان کو چرنے کو چھوڑتے ہو۔ اور وہ تمہارے بوجھ ایسی جگہوں پر پہنچاتے ہیں جہاں تم شدید مشقت کے بغیر پہنچنے والے نہیں بن سکتے تھے، بے شک تمہارا رب بڑا ہی شفیق و مہربان ہے اور اسی نے پیدا کیے گھوڑے اور خچر اور گدھے کہ تم ان پر سوار ہو اور وہ زینت بھی ہیں اور وہ ایسی چیزیں بھی پیدا کرتا ہے جن کو تم نہیں جانتے۔ اور اللہ تک سیدھی راہ پہنچاتی ہے اور بعض راہیں کج ہیں اور اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت پر کر دیتا۔

وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا جس میں سے تم پیتے بھی ہو اور اسی سے وہ نباتات بھی اگتی ہیں جن میں تم مویشیوں کو چراتے ہو۔ وہ اسی سے تمہارے لیے کھیتی، زیتون، کھجور، انگور اور ہر قسم کے پھل پیدا کرتا ہے۔ بے شک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو سوچیں۔ اور اس نے رات اور دن، سورج اور چاند کو تمہاری نفع رسانی میں لگا رکھا ہے اور ستارے بھی اسی کے حکم سے نفع رسانی میں لگے ہوئے ہیں، بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو سمجھیں، اور زمین میں جو چیزیں تمہارے لیے گوناگوں قسموں کی پھیلائیں، بے شک اس میں بھی بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو یاددہانی حاصل کریں۔

اور وہی ہے جس نے سمندر کو تمہاری نفع رسانی میں لگا رکھا ہے تاکہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور اس سے وہ زیور نکالو جو تم پہنتے ہو اور تم کشتیوں کو دیکھتے ہو کہ اس میں چیرتی ہوئی چلتی ہیں (تاکہ تم اس میں سفر کرو) اور اس کے فضل کے طالب بنو اور تاکہ تم اس کے شکرگزار بنو۔

اور اس نے زمین میں پہاڑ ڈال دیے ہیں کہ وہ تمہیں لے کر جھک نہ پڑے اور نہریں جاری کر دی ہیں اور راستے نکال دیے ہیں تاکہ تم راہ پاؤ اور دوسری علامتیں بھی ہیں اور ستاروں سے بھی وہ راہ معلوم کرتے ہیں۔

تو کیا وہ جو پیدا کرتا ہے ان کے مانند ہے جو کچھ بھی پیدا نہیں کرتے؟ تو کیا تم سوچتے نہیں؟ اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو تم ان کا احاطہ نہ کر سکو گے۔ بے شک اللہ بڑا ہی بخشنے والا، مہربان ہے۔ اور اللہ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو۔ اور جن کو یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ کچھ پیدا نہیں کرتے، وہ تو خود مخلوق ہیں، مردہ غیر زندہ، اور ان کو احساس بھی نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔ (النحل 16:21-4)

ساتواں اصول: صحت وورزش کا اہتمام

اسلام میں صحت و طاقت کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لیے صحت و ورزش کو مسلمان کی تربیت کے لیے بطور قانون حکم دیا ہے: حدیث میں آیا ہے:

''دو نعمتیں ایسی ہیں جن سے اکثر لوگ غافل رہتے ہیں صحت اور فراغت''۔ (بخاری)

اللہ کے نزدیک قوی مومن ضعیف مومن سے زیادہ بہتر اور پسندیدہ ہے۔ (احمد و مسلم)

''تیرے جسم کا تیرے اوپر حق ہے''۔ (متفق علیہ)

مسلمان کی یہ دعا ہوتی ہے۔

اے اللہ میں تجھ سے دکھ اور ملال کی پناہ مانگتا ہوں۔ (متفق علیہ)

ایک اور دعا ایسے آئی ہے۔

''اے اللہ میری سماعت میں عافیت عطا فرما' میری بصارت میں عافیت عطا فرما۔ میرے بدن میں عافیت عطا فرما' تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ (ترمذی)

ان تمام احادیث سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ صحت کا خاص خیال رکھا جائے۔ اس کے لیے دوا' خوراک' صفائی' ہوا کا اہتمام اور عمومی بچاؤ کی تدابیر اختیار کرنا ضروری ہے۔ گھر کا سربراہ ان تمام امور کا خیال رکھے' جب کوئی اہل خانہ میں سے بیمار ہو جائے تو اس کا علاج کیا جائے' ورزش میں کھیل کود اور چلنا سب سے بہترین ورزش ہے' جس طرح ذکر اذکار ضروری ہوتے ہیں اسی طرح جسمانی حرکت کے لیے ورزش کی بھی اہمیت ہے۔

[نوٹ یہ سلسلہ مضامین سعید حویٰ کی تصنیف ''البیت المسلم'' کی تلخیص و ترجمہ پر مشتمل ہے]

مبشر نذیر

ترکی کا سفر نامہ (23)

کمال کے دور میں جو تبدیلیاں لانے کی کوشش کی گئی، ان میں سے بعض وقت کی ضرورت تھیں اور بعض تبدیلیاں یقینی طور پر حد سے تجاوز نظر آتی ہیں۔ مناسب ہوگا کہ ان تبدیلیوں سے ہم اپنا نقطہ نظر بھی یہاں بیان کرتے جائیں۔ قارئین ہمارے نقطہ نظر سے اختلاف کر سکتے ہیں۔

تھیوکریسی، سیکولرازم اور اسلام

دور جدید کے مسلم ممالک میں یہ ایک بڑی بحث ہے کہ حکومت کو سیکولر ہونا چاہیے یا اسلامی۔ اس بحث میں اختلاف کے نتیجے میں ہمارے ہاں دو مستقل طبقے وجود میں آچکے ہیں جو کہ خود کو سیکولر یا اسلام پسند کہتے ہیں۔ پاکستان میں یہ بحث اس وقت اپنے عروج کو پہنچی جب یہاں کے ایک فوجی ڈکٹیٹر نے مصطفیٰ کمال کو اپنا آئیڈیل قرار دیتے ہوئے ترکی کی طرز پر تبدیلیوں کے عمل کا آغاز کرنا چاہا۔ اس بحث کا آغاز کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ تھیوکریسی اور سیکولر نظام ہائے حکومت کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے۔

قدیم دور اور قرون وسطیٰ میں حکومت کے لئے جو ماڈل رائج کیا گیا، وہ تھیوکریسی کہلاتا تھا۔ اس نظام کے مطابق یہ طے کر لیا جاتا تھا کہ حکومت کرنا صرف خدا کا حق ہے۔ خدا نے یہ حق بادشاہ کو اپنے نائب کے طور پر تفویض کیا ہے۔ بادشاہ اس حق کو خدا کے نمائندے کے طور پر استعمال کر سکتا ہے۔ حکومت کا ایک مذہب ہوگا جس کے مطابق ریاست کے معاملات چلیں گے۔ قانونی اعتبار سے ہر شہری کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ اس مذہب کی پابندی کرے کیونکہ یہ ''خدا کا حکم'' ہے۔ مذہب کی تشریح کرنا مذہب کے علماء کا کام ہوگا۔

اس نقطہ نظر کے تحت دنیا بھر میں بدھ، ہندو، مجوسی، یہودی، عیسائی اور اسلامی ریاستیں قائم ہوئیں۔ ان ریاستوں میں بادشاہ کو خدائی اختیارات حاصل ہوا کرتے تھے کیونکہ اس کی حیثیت خدا کے ایک نائب کی سی تھی۔ بعض مشرکانہ مذاہب میں تو یہ تصور تھا کہ خدا بادشاہ میں حلول کر جاتا ہے، اس وجہ سے بادشاہ کی عبادت دراصل خدا ہی کی عبادت ہوگی۔

مذہب کی تشریح کرنے کے لئے مذہبی علماء کو ایک خاص مقام حاصل تھا۔ حکومتی سطح پر مذہبی علماء باقاعدہ ایک تنظیم کی صورت اختیار کر جایا کرتے تھے جس کا ایک سربراہ ہوتا تھا۔ ان علماء کو

غیر معمولی اختیارات حاصل ہوا کرتے تھے۔ مذہبی معاملات میں آزادی رائے کا کوئی تصور نہ تھا۔ اگر کسی شخص کے نظریات ان علماء کے نظریات سے مختلف سامنے آتے تو مذہبی عدالت میں اس کا مقدمہ لے جایا جاتا۔ اس شخص کو اپنے نظریات سے توبہ کرنے کا کہا جاتا اور توبہ نہ کرنے کی صورت میں اسے مرتد قرار دے کر قتل کر دیا جاتا۔

اگر عملی اعتبار سے دیکھا جائے تو تھیوکریسی خدا کے نام پر انسان کی حکومت کا نام تھا۔ خدا کی کتاب کی ایک سے زائد توجیہات ممکن ہوا کرتی ہیں۔ توجیہ کے اس حق پر ایک مخصوص طبقے کی اجارہ داری قائم کر دینے کا معنی یہ ہے کہ آزادی اظہار کا قلع قمع کر دیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پوری دنیا میں ایک مخصوص طبقے کی اجارہ داری قائم ہوگئی۔ علماء نے بادشاہوں کو اور بادشاہوں نے علماء کو سپورٹ کیا۔ ایک دوسرے کی مدد سے عوامی آزادیوں کو سلب کرنے اور خدا کے نام پر انہیں اپنا غلام بنائے رکھنے کا یہ سلسلہ کئی صدیوں تک جاری رہا۔

یہ وہ ماحول تھا جس میں اسلام کا ظہور ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو حکومت قائم فرمائی وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب یعنی قرآن مجید کی بنیاد پر تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چونکہ خود اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے، اس وجہ سے آپ اپنے معاملات میں اللہ تعالیٰ سے براہ راست راہنمائی لیا کرتے تھے۔ آپ پر نبوت ختم ہوگئی۔ آپ کے بعد کسی کو یہ دعویٰ کرنے کا حق حاصل نہیں رہا کہ وہ خدا سے براہ راست راہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔ اب صرف اللہ کی کتاب باقی ہے یا اس کے پیغمبر کی سنت۔ ان کی توجیہ و تشریح کے لئے کسی ایک طبقے کو اختیار نہیں دیا گیا بلکہ ہر وہ شخص جو انہیں سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے، خواہ اس کا تعلق کسی طبقے سے کیوں نہ ہو، قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح کر سکتا ہے۔

قرآن مجید میں اہل ایمان کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے واضح طور پر یہ بتا دیا گیا کہ "ان کے معاملات باہمی مشورے سے چلتے ہیں"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے دور میں اجتماعی فیصلے ہمیشہ باہمی مشورے سے کئے جاتے تھے۔

[جاری ہے]

پروین سلطانہ حنا

ماں کا دن گزرنے کے بعد

ایک برس میں خالی اک دن
کیوں تجھ سے مخصوص کروں میں
میری عمر کے سارے لمحے
سارے دن اور ساری راتیں
سارے منظر ساری باتیں
بچپن کی وہ ساری یادیں
ماں تیرے دم سے روشن ہیں میرا جیون میری سانسیں

تیری ہستی میری بستی
بن تیرے بے رنگ رہے گی
میرا دل اور میری ہستی
گھر جائے گی طوفانوں میں
میرے جیون کی یہ کشتی
میری عمر کے سارے موسم
اور ساون کی سب برساتیں
ماں تیرے دم سے روشن ہیں میرا جیون میری سانسیں

جس دن میں تجھ کو نہ دیکھوں
اس دن مجھ کو چین نہ آئے
میری عمر تجھے لگ جائے
لیکن تجھ پر آنچ نہ آئے
کیسے بھول سکے گا یہ دل
تیرا چہرا تیری باتیں
ماں تیرے دم سے روشن ہے میرا جیون میری سانسیں

بنی اسرائیل سے لیا گیا عہد

''بنی اسرائیل سے ہم نے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔
اور ماں باپ، رشتے داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا۔
اور لوگوں سے بھلی بات کہنا۔
اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا، مگر تھوڑے آدمیوں کے سوا تم سب اس عہد سے پھر گئے اور اب تک پھرے ہوئے ہو۔
پھر ذرا یاد کرو، ہم نے تم سے مضبوط عہد لیا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ بہانا اور نہ ایک دوسرے کو گھر سے بے گھر کرنا۔ تم نے اس کا اقرار کیا تھا، تم خود اس پر گواہ ہو۔''
(البقرہ 2:83-84)

نیکی کیا ہے

''نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف،
بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے۔
اور مال کی محبت کے باوجود اسے رشتے داروں اور یتیموں، مسکینوں، مسافروں، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے۔
اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔
اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو اسے وفا کریں۔
اور تنگی اور مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں۔ یہ ہیں راستباز لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں۔''(البقرۃ 2:177)